www.mohaddis.com

322

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

محدث

جولائی ۲۰۰۸ء

۲ سزائے موت کے خاتمے کی مجوزہ ترمیم
۳۶ کیا والد بیٹے کے مال سے لے سکتا ہے؟
۴۶ اولیول کی اسلامیات میں فرقہ واریت

مجلس التحقیق الاسلامی
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL
PAKISTAN

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیرِ اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے **زرِ سالانہ:** ۲۰۰روپے **بیرون ملک:** ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ **ایڈریس:** ماہنامہ محدث، ۹۹جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 35866476 / 042 - 3586639 **موبائل:** 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __ www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

- عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

- آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ محدث لاہور پاکستان

مدیر
حافظ حسن مدنی
0333-4213525

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

جلد ۴۰ ؍ شمارہ ۷ —— رجب المرجب ۱۴۲۹ھ —— جولائی ۲۰۰۸ء

فہرست مضامین

فکر و نظر

سزائے موت کے خاتمہ کی مجوزہ ترمیم — حافظ حسن مدنی — ۲

تعلیم و تعلّم

دینی مدارس میں تعلیم قرآن کا جامع طریقہ — مولانا محمد بشیر — ۱۱

اولیول کی اسلامیات میں فرقہ واریت — سلیم منصور خالد — ۲۶

فقہ و اجتہاد

کیا والد بیٹے کے مال سے لے سکتا ہے؟ — شیخ سائد بکداش — ۳۶

سزائے موت؛ شریعت اسلامیہ کی نظر میں — حافظ حسن مدنی — ۵۳

اسلام اور مغرب

اعتدال پسندی یا مغرب پرستی؛ چند تاثرات — محمد سرور — ۶۷

زر سالانہ
=/۲۰۰ روپے

فی شمارہ =/۲۰ روپے

بیرونِ ملک

زر سالانہ
=/۲۰ ڈالر

فی شمارہ =/۲ ڈالر

Monthly MUHADDIS A/c No: 984
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کا پتہ
۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

☎ : 5866476
5866396
5839404

Email:
hhasan@wol.net.pk

Publisher:
Hafiz Abdul Rahman Madani

Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore

Islamic Research Council

محدث کتاب و سنت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کُلی اتفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر ونظر

سزاے موت کے خاتمہ کی مجوزہ ترمیم

چند برس قبل جب عالمی میڈیا میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سنگین خدشات اُبھارے جاتے، ۲۰۱۲ء میں پاکستان کے خاکم بدہن صفحۂ ہستی سے مٹ جانے یا تقسیم ہوجانے یا ۲۰۱۵ء میں امریکہ کے سرکاری نقشہ میں پاکستان کا نام ونشان غائب ہونے کی باتیں کی جاتیں تو یہ اَفواہیں دشمن کی خواہشات اور یک طرفہ پروپیگنڈا کے سوا کچھ نہ دکھائی دیتیں لیکن گذشتہ ایک برس سے وطن عزیز کی بدترین کیفیت اور ہر طرف سے مسائل و مشکلات میں گھری صورتحال کو دیکھ کر واقعتاً اس عظیم عطیہ خداوندی کے بارے میں ذہن میں کئی شکوک وشبہات اور اندیشے گہرے ہونا شروع ہوچکے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں اسلام کے نام پر ایک مملکت کا وجود کسی عظیم معجزہ اور خصوصی عنایتِ الٰہی کا اظہار ہے لیکن اس ملک کے ساتھ غیروں کی سازشیں تو رنگ نہ لاسکیں، البتہ اس ملک کے باسیوں کی بدعملیوں اور کوتاہیوں نے اسے ممالک کی صف میں ایک شرمناک مقام ضرور دلا دیا ہے۔

ہر طرف سے سنگین مسائل میں گھرے وطن کو اس کے حکمران کسی المیہ سے نجات دلانے کی خواہش کی بجائے مزید سے مزید تر مصائب ومشکلات میں اُلجھاتے ہی نظر آتے ہیں۔ گذشتہ برس کے انہی دنوں میں لال مسجد میں چہار سو موت کی خاموشی پھیلا دینے والے 'آپریشن سائلنس' سے لے کر 'آپریشن صراطِ مستقیم' تک کتنی ہی رسوائیاں حکمرانوں کے دامن پر موجود ہیں۔ صرف ایک سال کے قلیل عرصے میں ایک عظیم مملکت کس طرح 'پاکستان' سے 'مسائلستان' کا روپ دھارتی ہے، اس کا طائرانہ نظارہ بھی چشم کشا اور عبرت آموز ہے۔

مسائل میں گھرے عوام اور بنیادی سہولیات کے لئے سسکتے بلکتے لوگوں کی دادرسی کے لئے کوئی اِقدام کرنے کی حکومت کو کوئی فکر نہیں۔ بد اَمنی، مہنگائی، بجلی، بے روزگاری اور دین

www.KitaboSunnat.com

بیزاری جیسی بدترین صورتحال سے نمٹنے کا حکومت کے پاس کوئی وقت نہیں اور محض ۱۰۰ دن گزرنے اور موروثی مسائل کا کہہ کر اپنی ذمہ داری سے جان چھڑا لی جاتی ہے، لیکن اگر ملک کے معصوم عوام 'مسلمانوں' پر قیامت ڈھانے کا کوئی مسئلہ ہو یا اسلام کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام پیش نظر ہو تو اس میں حکومت کی جراءتیں اور دلچسپیاں دیدنی ہوتی ہیں۔ حکمرانوں کا یہی رویہ اس ملک کے لئے پہلے بھی سنگین آزمائش بنا رہا ہے اور اب بھی اسے مزید ناکامیوں سے دوچار کرنے کا سبب ٹھہرے گا۔ کاش! ہمارے حکمران ہوش کے ناخن لیں اور ربِّ کریم کو ناراض کرکے اپنی ناکامی ونامرادی کو خود ہی دعوت نہ دیں۔

پاکستان میں دو برس قبل جس طرح حدود قوانین میں تبدیلی کے لئے مجنونانہ میڈیا مہم بروے کار لائی گئی تھی، اور اس کے نتیجے میں ایسا ظالمانہ قانون ملک میں نافذ کردیا گیا تھا جو ملک کے اسلامی تشخص پر آج بھی کلنک کا ایک ٹیکہ ہے، اسی طرح گذشتہ ایک ماہ سے پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے مغربی دباؤ اور پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر سزاے موت کے خاتمے کی بھی کوشش شروع کررکھی ہے اور وفاقی کابینہ نے اس سزا کو ختم کرنے کی منظوری دیتے ہوئے ایوانِ صدر میں مسودہ بھیج دیا ہے۔

یہ قانون جہاں پاکستان میں نافذ موت کی ۲۶ سزاؤں میں تبدیلی کا موجب ٹھہرے گا، وہاں اس کے ذریعے پاکستان میں نافذ العمل قصاص ودیت کے اسلامی قوانین میں بھی غیر شرعی تبدیلی واقع ہوگی۔ مزید براں توہین رسالت کا قانون بھی عملاً غیر مؤثر ہوکر رہ جائے گا، جس کے خاتمے کے لئے مغرب عرصۂ دراز سے پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے۔

یاد رہے کہ پیپلز پارٹی کی سرگرم رکن اور موجودہ وفاقی وزیر اطلاعات شیری رحمٰن نے حدود اللہ میں ترمیم کو بھی اپنا 'سنہرا کارنامہ' قرار دیا تھا اور موجودہ رسوا کن تبدیلی کے سلسلے میں بھی اسی کابینہ کا نام لیا جارہا ہے۔ اللہ کے قانون سے کھیلنا اور اس پر اِترانا اللہ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور مسلمانی کا دعویٰ کرنیوالے نامعلوم یہ جرات کہاں سے حاصل کرلیتے ہیں کہ دل میں کسی ملال وپریشانی کے بجائے اپنے سیاہ کارناموں پر فخر بھی کرنا شروع کردیں۔

'سزائے موت کا خاتمہ' انسانی حقوق کی مغربی تنظیموں کا پرانا مطالبہ اور اس گھسے پٹے تصور

www.KitaboSunnat.com

کی بازگشت ہے کہ ''تہذیب وتمدن کے موجودہ دور میں ایسی سزائیں وحشیانہ، ظالمانہ اور انسانی عزوشرف کے منافی ہیں۔ ایک انسان مر گیا لیکن اس کے بدلے ایک جیتے جاگتے انسان کو جینے کے حق سے محروم کر دینا انسانیت کی توہین ہے۔اس موقف کے علم برداروں کی یہ جدوجہد ہے کہ دنیا بھر کے دساتیر سے سزائے موت کے قانون کو نکال کر اسے منسوخ وکالعدم کر دیا جائے تاکہ معاشرے میں متحارب فریقوں کے انتقامی جذبات کو ٹھنڈا کر کے امن وآشتی اور مصالحت ومفاہمت کا ماحول پیدا کرنے میں مدد مل سکے۔''

'سزائے موت کے خاتمے' کے پس پردہ مغرب کے 'خود ساختہ انسانی حقوق' کی تنظیمیں، یورپی یونین کے ممالک اور خود اقوامِ متحدہ ہے جس کی جنرل اسمبلی کی ایک قرارداد کہ سزائے موت کو دنیا بھر سے ختم ہونا چاہئے، پر گذشتہ سال رکن ممالک کی اکثریت نے دستخط کئے تھے۔ کئی سالوں سے مختلف ممالک میں اس سزا کے خاتمے کے لئے مغربی ادارے کانفرنسیں اور سیمینارز منعقد کرا رہے ہیں اور گذشتہ برس ۱۰/اکتوبر ۲۰۰۷ء کو اقوامِ متحدہ کی طرف سے عالمی سطح پر سزائے موت کے خاتمے کے دن کے طور پر بھی منایا گیا ہے۔

جماعتِ اسلامی کے نائب امیر سید منور حسن نے سزائے موت کی تبدیلی پر اپنے ایک مذمتی بیان میں یہ قرار دیا ہے کہ ''اس سزا کے خاتمے سے دراصل توہین رسالت جیسے سنگین جرم کی سزا کو معطل کیا جانا مقصود ہے۔ اور حکمران طبقہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ناراض کر کے مغربی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔'' (روزنامہ جنگ: ۵/جولائی ۲۰۰۸ء)

قانونِ سزائے موت کے سلسلے میں عملی صورتحال یہ ہے کہ فی الوقت دنیا کے ۹۰ ممالک میں موت کی سزا ختم کی جا چکی ہے جبکہ ۶۶ کے قریب ممالک میں تاحال یہ سزا برقرار ہے جن میں امریکہ اور چین سرفہرست ہیں۔ عراقی حکومت نے بھی سزائے موت کو تبدیل کر دیا تھا لیکن طرفہ تماشا دیکھئے کہ صدام حسین کی پھانسی سے چند روز قبل سزائے موت کے قانون کا دوبارہ اِجرا کیا گیا اور بعد میں پھر اس کو معطل کر دیا گیا۔

اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے 'ایمنسٹی انٹرنیشنل' کے مطابق ''گذشتہ سال چین میں سزائے موت کے سب سے زیادہ یعنی ۸ ہزار واقعات رونما ہوئے ہیں۔ اور اس وقت پانچ

www.KitaboSunnat.com

ممالک میں سب سے زیادہ مجرم سزاے موت کے قانون کا نشانہ بن رہے ہیں، جن کے نام بالترتیب یہ ہیں: چین، ایران، سعودی عرب، پاکستان اور امریکہ''

پاکستان میں گذشتہ سال ۱۲۶/ اَفراد کو سزاے موت دی گئی اور اس وقت ملک کی مختلف جیلوں میں ۷ ہزار کے لگ بھگ قیدی کال کوٹھری میں سزاے موت کے منتظر ہیں۔ پاکستان میں عاصمہ جہانگیر کا 'انسانی حقوق کمیشن' اپنے مغربی آقاؤں کی سرپرستی میں کئی سالوں سے موت کی سزا کے خاتمے کی تحریک چلا رہا ہے۔ اس قانون میں موجودہ تبدیلی کا فوری محرک بھارت کے ایک قیدی کشمیر سنگھ کی سزاے موت معاف کرنے کی اپیل ہے جو صدر کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔ سزاے موت کے قانون میں موجودہ تبدیلی کو ملک میں اسی حقوق کمیشن نے سراہا ہے، جبکہ دیگر قانونی، سیاسی، معاشرتی اور اسلامی حلقے اس خلافِ شریعت تبدیلی پر سراپا احتجاج ہیں۔

انسانی حقوق کمیشن نے موت کی سزا کے سلسلے میں ایک رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''توہین رسالت واحد ایسا قانون ہے جس کی لازمی سزا موت ہے، علاوہ ازیں ملک میں 'قانونِ قصاص ودیت' کی بنا پر بھی سزاے موت کے واقعات میں کافی تیزی آئی ہے۔ کمیشن نے عدالتِ عظمیٰ پر بھی یہ الزام عائد کیا ہے کہ ۲۰۰۳ء میں سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں جرم قتل کی سزا میں سزاے موت کی تلقین کرکے اس کو مزید رواج دیا ہے۔''

سیاسی صورتحال

اس سے قبل ۲۰۰۰ء میں ۱۸ سال سے کم عمر مجرموں کی سزاے موت کو ممنوع قرار دیا گیا تھا جس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل زیر سماعت ہے، البتہ سزاے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کی تازہ تبدیلی کا محرک وزارتِ داخلہ کی ایک سفارش ہے، جسے مشرف کے دورِ آمریت میں اہم عہدوں پر کام کرنے والے سیکرٹری سید کمال شاہ کے دستخطوں سے وزیراعظم سیکرٹریٹ کو بھیجا گیا ہے۔ یاد رہے کہ وزارتِ عظمیٰ کے بعد اہم ترین وزارتِ داخلہ کا قلم دان بھی تاحال پیپلز پارٹی یا مسلم لیگ کے کسی رکن کو سونپنے کی بجائے صدر مشرف کے بااعتماد ساتھی رحمٰن ملک کے ہی سپرد ہے جو مشیر کے منصب سے ہی اس وزارت کے تمام معاملات چلا رہے ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

پرویز مشرف رحمٰن ملک کی کارکردگی سے انتہائی مطمئن ہیں اور ان کا اس اہم ذمہ داری کو ادا کرنا پرویز مشرف کی پیپلز پارٹی سے اسی مفاہمت کا نتیجہ ہے جس کا خمیازہ متعدد سیاسی معاملات میں قوم بھگت رہی ہے۔

وزارتِ داخلہ کی یہ سمری وفاقی کابینہ کے سامنے پیش کی گئی جہاں سے قانونی مشاورت کے لئے اسے وزارتِ قانون میں بھیج دیا گیا۔ وزارتِ قانون نے اس تبدیلی کی شدید مخالفت کرتے ہوئے اسے پاکستان کے قانونی ڈھانچے، عدالتِ عظمیٰ کے فیصلوں اوراسلامی شریعت کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے نظر انداز کردینے کی ہدایت کی لیکن وزارتِ قانون کے مشورہ کو قبول کرنے کی بجائے وفاقی کابینہ نے ۲۱؍جون کو بے نظیر بھٹو کے یومِ ولادت کے موقع پر قوم کو خوش خبری دینے کے بہانے سزائے موت کے قانون میں ہی تبدیلی کردی جس کے نتیجے میں ملک بھر میں موجود ۷ ہزار کے قریب سزائے موت پانے والے مجرموں کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوگئی اوراس مسودہ کو دستخط کے لئے ایوانِ صدر بھیج دیا گیا۔

یاد رہے کہ وفاقی کابینہ کے ترجمان سے اس سلسلے میں جب رابطہ کیا گیا تو اُنہوں نے کہا کہ بدھ ۳؍جولائی کو کابینہ کے کراچی اجلاس میں سزائے موت کی تبدیلی کا مسئلہ زیر بحث ہی نہیں آیا اور کابینہ نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا، جب کہ وزیر اعظم سیکرٹریٹ نے اس مسئلہ کو وفاقی کابینہ کے فیصلہ کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ (جنگ: ۶؍جولائی)

وفاقی کابینہ کے ترجمان کے اس بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سزائے موت کے قانون میں حالیہ تبدیلی کابینہ کو اعتماد میں لینے کی بجائے درحقیقت پرویز مشرف کے اشاروں پر ہورہی ہے کیونکہ اس کے دیگر کردار مثلاً سید کمال شاہ اور رحمٰن ملک اُنہی کے گرد ہی گھومتے ہیں، اور مشرف اپنے مغربی سرپرستوں کو خوش کرنے کے لئے پیپلز پارٹی کی حکومت کو بھی استعمال کررہے ہیں، البتہ وزیر اعظم سید یوسف رضا گیلانی کی زبان سے ۲۱؍جون کے موقعہ پر یہ اعلان کرنے کی بنا پر پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت اس کی ذمہ داری سے بری نہیں ہوسکتی۔

ایک طرح ایوانِ صدر اور حکومت کی تو یہ صورتحال ہے، ان حالات میں عدالتی نظام اور دستوری تقاضوں کو برقرار رکھنے کے لئے عدالتِ عظمیٰ کو ازخود حرکت میں آنا پڑا اورمؤرخہ

www.KitaboSunnat.com

۶/جولائی کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر نے اس اہم قانون میں پارلیمنٹ سے بالا ہی بالا تبدیلی کی خبر پر ازخود نوٹس لیتے ہوئے متعلقہ اداروں کو مؤرخہ ۱۴/جولائی کو عدالت میں پیش ہونے کا حکم صادر کردیا ہے۔ فاضل عدلیہ کے یہی ایسے رویے ہیں جن کی بنا پر ایوانِ صدر کو ان کا کردار محدود کرنے اور ازخود نوٹس لینے کے اختیارات کے خاتمے وغیرہ کی قانونی ترامیم کئے بنا کوئی چارہ نہیں رہتا.....!!

قانونی جائزہ

سزاے موت کے قانون میں تبدیلی کے پس منظر، مقصد وہدف اور تازہ ترین صورتحال کے ایک مختصر جائزے کے بعد اس مسئلہ کی قانونی صورتحال ملاحظہ ہو:

پاکستان کا مقصدِ وجود ہی اسلام کو زندگی کے ہر میدان میں نافذ کرنا تھا، وگرنہ عبادات اور ذاتی زندگی کی حد تک تو مسلمان متحدہ ہندوستان میں بھی اسلام پر عمل کیا کرتے تھے اور آج بھی کررہے ہیں۔ پاکستان کا بنیادی مقصد انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی احکامات کی روشنی میں بسر کرنا ہے۔ اسی بنا پر آزادی کے فوری بعد انڈیا نے تو اپنے آپ کو ایک سیکولر ملک قرار دیا، جبکہ پاکستان میں ذاتِ الٰہی کو اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ بعد ازاں دستورِ پاکستان کے آرٹیکل ۲ میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا اور ۲/اے میں کتاب وسنت کو پاکستانی آئین کی بنیاد بنایا گیا۔

دستورِ پاکستان ۱۹۷۳ء کی شق نمبر ۲۲۷/اے میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ

''تمام موجودہ قوانین کو اسلام کے احکام..... جیسے کہ وہ قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول میں بیان ہوئے ہیں..... کے مطابق بنایا جائے گا۔ دستور میں جس طرح اسلام کے احکام کا حوالہ دیا گیا ہے، ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو اسلام سے متصادم ہو۔''

قرآن وسنت کی برتری کو اس طرح بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ تمام اہم قومی عہدیداروں سے ان کے حلف نامے میں اسلام کے تحفظ کا وعدہ لیا گیا جس کا پاکستان کا ہر صدر، وزیراعظم، وفاقی وزرا، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، چیئرمین سینٹ، صوبائی گورنرز اور جملہ اراکینِ اسمبلی وسینٹ اپنے عہدہ کے آغاز میں اقرار کرتے ہیں۔ دستور کے شیڈول ۳ میں اس حلف کے الفاظ ہیں کہ

www.KitaboSunnat.com

''میں حلف اُٹھاتا ہوں کہ میں اسلامی نظریہ کے تحفظ کی ضرور بھرپور جدوجہد کروں گا جو کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد ہے۔''

مزید برآں آرٹیکل ۱۹ میں آزادئ اظہار کے بنیادی حق کو بھی عظمتِ اسلام کے تابع قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی سپریم کورٹ کے بعض فیصلوں مثلاً ظہیر الدین کیس ۱۹۹۳ء وغیرہ میں کتاب وسنت کو بالاتر قانون قرار دیتے ہوئے تمام انسانی حقوق کو بھی اسلامی حدود وتصورات کے تابع رکھا گیا ہے۔ آئین کے انہی اسلامی تقاضوں کے پیش نظر پاکستان میں وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل اور متعدد اسلامی قوانین مثلاً حدود قوانین، قانونِ توہین رسالت اور قانونِ قصاص ودیت وغیرہ کو اسلام کی بنا پر مدوّن کرکے ملکی قانون کا حصہ بنایا گیا ہے۔

اسلام کے حوالے سے ان مذکورہ بالا آئینی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سزائے موت کے خاتمے کی موجودہ ترمیم کو اگر دیکھا جائے تو یہ ترمیم سراسر خلافِ اسلام نظر آتی ہے، کیونکہ اسلام میں نصف درجن سے زائد جرائم پر موت کی سزا موجود ہے اور خود یہ سزائیں دربارِ نبویؐ سے صادر ہوئی ہیں جیسا کہ اس کی مستند تفصیلات ایک مستقل مضمون میں پیش کردی گئی ہیں۔ چنانچہ اس بنیاد پر اُصولی طور پر ہی یہ ترمیم خلافِ اسلام ہونے کے ناطے قابل استرداد ہے!

جہاں تک پاکستان میں رائج قوانین کی بات ہے تو اس کی رو سے بھی مختلف جرائم پر موت کی سزا رکھی گئی ہے اور ایسے جرائم کی تعداد ۲۶ کے لگ بھگ ہے مثلاً بغاوت، آئین توڑنا، اور منشیات استعمال کرنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں جو اسلامی قوانین ملک میں نافذ ہیں، ان کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو مندرجہ ذیل تین اسلامی قوانین میں موت کی سزا مقرر کی گئی ہے:

۱۔ قانون توہین رسالت (مجموعہ تعزیرات پاکستان: دفعہ ۲۹۵ سی)

۲۔ قانون قصاص ودیت (مجموعہ تعزیرات پاکستان: دفعہ ۳۰۲ ب)

۳۔ حدود قوانین میں سزائے رجم (قانونِ حد زنا ۱۹۷۹ء: دفعہ ۵ ب)

مندرجہ بالا اعتبارات سے دیکھا جائے تو موجودہ ترمیم کئی پہلوؤں سے ناقابل قبول اور ملک کے بنیادی قانونی ڈھانچے سے متصادم ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وزارتِ داخلہ کا موجودہ اقدام اور وفاقی کابینہ کا مبینہ طور پر

www.KitaboSunnat.com

اسے ایوانِ صدر بھیجنا کیا اس قانون میں ترمیم کے لئے اُصولی طور پر کافی ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں واضح رہنا چاہئے کہ صدر کو آئین کا آرٹیکل نمبر ۴۵ یہ حق دیتا ہے کہ وہ کسی بھی عدالت، ٹربیونل یا اتھارٹی کی طرف سے کسی فرد کی سزا میں تبدیلی کرسکیں جبکہ ایسا کرنا عوامی مفاد میں ہو۔ صدر کا یہ اختیار اُن ۲۳ جرائم کی سزاؤں کی حد تک تو کسی معینہ مجرم کے لئے معتبر قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ جہاں تک اسلامی قوانین مثلاً حدود، قصاص اور توہین رسالتؐ کے قوانین کا تعلق ہے تو ان میں معافی کا یہ حق قانونی طور پر صدر کو بھی حاصل نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سزائیں اللہ تعالیٰ کی طے کردہ ہیں، جن میں تبدیلی کا اختیار سید المرسلین ﷺ کے پاس بھی نہیں ہے، کجا یہ کہ ان کا کوئی ادنیٰ اُمتی ان سزاؤں میں ترمیم یا تخفیف کرسکے۔ اس سلسلے میں بنومخزوم کی ایک چور عورت کا واقعہ ذہن میں رہنا چاہئے جس کے بارے میں حضرت اسامہ معافی کی درخواست لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گئے اور آپ نے اس عورت کو معاف کرنے کی بجائے یہ تاریخ ساز جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ

«أتشفع في حد من حدود الله . لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد يدها» (صحیح بخاری: رقم ۶۷۸۸)

''کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ اگر (میری بیٹی) فاطمہ بنتِ محمدؐ بھی چوری کرتی تو محمد ﷺ اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتے۔''

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر موصوف بالفرض اس قانون کی منظوری پر دستخط ثبت کر بھی دیں، تب بھی ان اسلامی سزاؤں میں ترمیم نہیں ہوسکتی کیونکہ انہیں اس کا اختیار قانونی طور پر سرے سے حاصل ہی نہیں جیسا کہ قانونِ حد زنا ۱۹۷۹ء کی دفعہ ۲۰ کی شق ۵ اُنہیں اس کا اختیار نہ ہونے کے بارے میں بالکل واضح ہے۔

یہی سوال سپریم کورٹ کے سامنے ۱۹۹۲ء میں اُٹھایا گیا تو فاضل عدالت نے یہ قرار دیا کہ صدر کو حدود اور قصاص کی سزاؤں میں معافی کا کوئی اختیار نہیں، صدر کو یہ اختیار صرف اس وقت ہے جب موت کی سزا بطورِ تعزیر دی گئی ہو اور متعلقہ مجرم کے لئے اس سزا کا ختم کرنا عوامی مفاد میں ہو۔ (سکینہ بی بی بنام وفاق پاکستان، پی ایل ڈی ۱۹۹۲ء، لاہور ۹۹)

www.KitaboSunnat.com

مندرجہ بالا قانونی توجیہ اور مقدمے کا حوالہ وفاقی وزارتِ قانون کے اس جواب سے ماخوذ ہے جو وفاقی کابینہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اور اس مراسلہ کی تفصیلات سے روزنامہ جنگ نے مؤرخہ ٦/ جولائی کے اِداریے میں پردہ اُٹھایا ہے۔

اس تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ موت کی سزا کا خاتمہ مغربی قوتوں کے دباؤ اور انسانی حقوق کے مغربی تصور کا نتیجہ ہے جس میں اسلام کے تصورِ جرم اور احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجرم سے نرم سلوک کر کے معاشرے میں بھائی چارہ پیدا کرنے کی فرضی کوشش بروئے کار لائی جا رہی ہے۔ یہ ترمیم مشرف کے کارندوں کے ذریعے عمل میں لائی جا رہی ہے جس میں وزیراعظم غالباً اسی سیاسی مفاہمت کی بنا پر شریک ہیں جو پیپلز پارٹی اور پرویز مشرف کے مابین پروان چڑھ رہی ہے۔

حالیہ مجوزہ ترمیم سے جہاں ملک کے قانونی ڈھانچے کے شدید متاثر ہونے کا خدشہ ہے، وہاں اس ترمیم میں دراصل رہے سہے اسلامی قوانین کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش بھی کارفرما ہے۔ قانونی پہلو سے اس ترمیم کے غیر مقبول ہونے کی بنیاد بھی آخر کار اللہ کے دیے ہوئے قوانین اور نبی کریم ﷺ کے فرامین مبارکہ ہی ہیں جس کی تفصیل مستقل مضمون میں پیش کی گئی ہے۔ حکومتِ وقت کو اپنی ذمہ داری نبھانے، عوام کو ریلیف دینے یا ملک کو مشکلات سے نکالنے کے کسی ٹھوس اقدام کی توفیق ہے اور نہ ہی فرصت، لیکن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی اقدام کے لئے اس پریشانی وآزمائش کے دور میں بھی حکومت پرویز مشرف کی قیادت میں یکسو ہے۔ مسلمانانِ پاکستان کو چاہئے کہ اس سلسلہ میں عدالتِ عظمیٰ کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے اپنا مکمل احتجاج ریکارڈ کرائیں تاکہ حدود قوانین کی طرح ملک میں رہے سہے اسلامی قوانین بھی غیر مؤثر ہو کر نہ رہ جائیں۔ دینی جماعتوں او رتحریکوں کو یہ مسئلہ بھی اپنے ترجیحی ایجنڈے میں شامل کرنا چاہئے کہ یہ ان کے مقصدِ وجود کا بنیادی تقاضا ہے اور ان کی بنیادی اور منصبی ذمہ داری بھی!

(حافظ حسن مدنی)

www.KitaboSunnat.com

تعلیم وتعلّم

مولانا محمد بشیر

دینی مدارس میں تعلیم قرآن کا جامع اور صحیح طریقہ

یہ امر کسی سے مخفی نہیں ہے کہ ہمارے ملک، برصغیر پاک وہند کے پورے علاقے کی دینی درسگاہوں بلکہ سرکاری سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی، قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس کا جو طریقہ عرصۂ دراز سے رائج چلا آرہا ہے، وہ 'ترجمہ قرآنِ کریم' کے نام سے معروف ہے۔ یہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے مرحلے میں تین چار سال تک جاری رہتا ہے۔ اور اس کی تدریس یوں ہوتی ہے کہ درس کے آغاز پر ایک طالبعلم مقررہ آیات تلاوت کرتا ہے، پھر معلم ان آیاتِ کریمہ کا اپنی مقامی زبان اُردو، پشتو یا سندھی وغیرہ میں ترجمہ سکھاتا ہے۔ وہ ان کا ترجمہ کرتے ہوئے ان میں مذکور مشکل الفاظ اور تراکیب کی حسبِ ضرورت تشریح بھی کرتا جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات اس ترجمہ اور تشریح کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنتے ہوئے یاد کرلیتے ہیں۔ کچھ مدرّسین اور شیوخ خصوصاً تفسیر قرآن کے مرحلے میں قرآنی مطالب کی تفسیر کو اِملا بھی کرادیتے ہیں۔ بلا شبہ قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس اور تفسیر کے اس منہج سے زیر تعلیم طلبہ کو مندرجہ ذیل تعلیمی اور دینی فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ

① وہ قرآنِ کریم کے لفظی اور بامحاورہ معنی سیکھ لیتے ہیں۔

② وہ قرآنِ کریم کے الفاظ اور تراکیب کو سمجھنے لگتے ہیں اور کسی حد تک ان کی لغوی، صرفی اور نحوی تشریح سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔

③ وہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ اور تشریح نیز تفسیر پڑھ کر اس کے متن کے براہِ راست فہم ومطالعہ کی اہلیت حاصل کرلیتے ہیں، اور قرآنی احکام وارشادات سے استفادہ کے اہل ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ ان متعدد فوائد کی بنا پر 'ترجمہ قرآن حکیم' کا یہ مضمون ہماری تمام چھوٹی اور بڑی

* مدیر معهد اللغة العربية، اسلام آباد مشہور کتاب 'عربی کا معلّم' وغیرہ کے مصنف

www.KitaboSunnat.com

درسگاہوں میں جاری وساری ہے اور اس کی افادیت پر تمام علماء اور مدرّسین کا اتفاق ہے۔

تنقیدی نظر

میں اس امر سے اتفاق کرتا ہوں کہ ترجمہ قرآنِ کریم کی تدریس سے مذکورہ بالا فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور اس مضمون کے مروّجہ طریقۂ تدریس کی اِتنی افادیت مسلّمہ امر ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس کے یہ فوائد خود ناکافی اور محدود ہیں اور یہ اس کی تعلیم وتدریس کے کئی دیگر بنیادی تعلیمی مقاصد کا اِحاطہ نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ طریقۂ تدریس عالمی سطح پر مسلّمہ تعلیمی معیار پر پورا نہیں اُترتا اور بچوں کی اچھی تعلیم وتربیت کے کم از کم لازمی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا۔ چنانچہ انہی اسباب کی بنا پر ہمارے نونہالوں کی تعلیم وتربیت کے کئی اہم اور بنیادی گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اور مملکتِ پاکستان میں ہماری دینی اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لئے جس سطح کے ماہر معلّمین، اساتذہ، علما اور اسکالرز کی ضرورت ہے، ان کی تعلیم وتربیت میں بھی یہی ناقص طریقۂ تدریس نافذ وغالب ہے، اس لئے بہتر نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ اس طریقۂ تدریس کے فوائد کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہیں۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں زیرِ تعلیم بچوں کو قرآنِ کریم کی آیاتِ کریمہ کا صرف مقامی زبان میں ترجمہ کرنے پر لگا کر قرآن کی آسان عربی زبان اور اَدب کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور اُنہیں اس کو لکھنے یا بولنے کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ بلکہ اُنہیں ایسی تربیت یا مشق سے کئی سال تک مسلسل لاتعلق رکھتے ہوئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اتنا جامد کردیا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ عربی زبان وادب میں اچھی صلاحیت یا بلند مقام کا سوچ بھی نہیں سکتے، اور وہ اس کے بارے میں ہمیشہ کے لئے مایوسی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اس لئے تعلیم قرآن کریم کے مروّجہ طریقۂ تدریس کی فوری اِصلاح کرتے ہوئے اسے اپنے قومی اور ملی مقاصد اور تعلیم وتربیت کے جدید تقاضوں کے مطابق ترقی دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ میں دینی مدارس کے اساتذہ، مہتمم حضرات اور تعلیمی وفاقوں کے ذمہ دار بلند مرتبہ علماے کرام اور شیوخ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری ان گزارشات پر توجہ فرمائیں۔

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله!

www.KitaboSunnat.com

ہمارے دینی تعلیمی نظام کا اہم ترین مضمون تعلیم قرآنِ کریم ہے اور زیر تعلیم طلبہ وطالبات کو اس کی بہتر تعلیم وتفہیم کی خاطر اُنہیں عربی زبان وادب اور حدیث وفقہ نیز اُصول کے کئی علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس لیے ایک ایسی جماعت جسے ہم مستقبل میں اُمت کی تعلیمی اور فکری قیادت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور وہ عنقریب معلم، ادیب، مفتی وخطیب اور محدث ومفسر کی عظیم ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے، اس کو کتاب اللہ اور فرقانِ حمید کی تعلیم وتدریس کا طریقہ اور منہج ایسا جامع، منظّم اور مثالی ہونا چاہیے جو اُنہیں قرآنی الفاظ اور عبارتوں کا ترجمہ سکھانے کے ساتھ ساتھ ان کی عمدہ فکری، لسانی اور ادبی تربیت ومہارت کی اَساس بن سکے۔

صرف لفظی ترجمہ رٹنے کا متعدی مرض

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تعلیم قرآنِ کریم کا یہ عظیم ترین مضمون، اس کی عبارت کا صرف لفظی اور زبانی ترجمہ رٹنے اور رٹانے تک محدود چلا آ رہا ہے اور تین چار سال تک اسی نہج پر چلتا رہتا ہے، اور ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اس مضمون کے دوسرے سال یا اگلے سالوں میں اس کے تعلیمی مقاصد یا تدریسی نہج میں مزید ترقی کرتے ہوئے اس میں مزید تعلیمی مقاصد کا اضافہ کر دیا جائے۔ نتیجتاً معلّمین اور طلبہ وطالبات سب کی نظریں اسی لفظی ترجمہ کو پڑھنے، پڑھانے اور یاد کرنے تک مرکوز اور محدود رہتی ہیں۔ رہا قرآنِ کریم کا اصل عربی متن تو وہ ان سب کی نظروں سے اس قدر اوجھل رہتا ہے کہ اس پورے عرصے میں اُنہیں اس کی عبارتوں، استعمالات اور الفاظ کے فہم ومطالعہ پر کوئی بحث یا مشق نہیں کرائی جاتی۔ اس لیے وہ قرآنِ کریم کے نہایت آسان عربی استعمالات اور محاوروں سے بھی ناواقف رہتے ہیں اور مشہور قرآنی افعال کے مادوں اور ان کے صلات تک کو نہیں سمجھتے۔

ہماری اسلامی درسگاہوں میں تعلیم قرآن ایسے بنیادی اور اہم اسلامی مضمون کا یہ جمود نسل درنسل چلا آ رہا ہے اور اس نے ہمارے لاکھوں ذہین اور محنتی نوجوانوں کی تعلیم وتربیت پر کئی منفی اثرات ڈالے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ نمایاں نقصان یہ ہے کہ ان لاکھوں نوجوانوں کو کتابِ حکیم کی عربی زبان وادب کے فہم ومطالعہ سے اس حد تک محروم رکھا جاتا ہے کہ اس کی تدریس تین چار سال کا طویل عرصہ جاری رہنے کے باوجود معلّمین یا طلبہ کو اس پر

www.KitaboSunnat.com

عربی زبان میں چند صفحات لکھنے یا بولنے کی مشق نہیں کرائی جاتی۔ آپ کو شاید دنیا کے کسی ترقی یافتہ تعلیمی نظام میں کسی کتاب یا کورس کا محض لفظی ترجمہ رٹانے کے اس جمود کی ایسی کوئی مثال نہ ملے جو ہماری درسگاہوں میں سالوں تک جاری رہتا ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ جمود عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عام لوگ جو کسی مستند تعلیمی درسگاہ میں نہ پڑھتے ہوں، وہ اگر اپنی کاروباری مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر صرف ترجمہ قرآن کریم پڑھیں تو یہ ان کے لیے بہت کام کی بات ہے، کہ وہ اس طرح قرآن کریم کے الفاظ کا لفظی ترجمہ یاد کرکے اللہ تعالیٰ کے احکام اور ارشادات سے آگاہ ہورہے ہیں۔ لیکن جس گروہ نے اپنی عمروں کا بہترین وقت کسب وتعلّم کے لئے وقف کیا ہوا ہے اور وہ اسلامی تعلیم اور عربی زبان کے تمام بنیادی علوم وفنون کو سالہا سال پڑھیں گے اور مستقبل میں بلند علمی مناصب پر فائز ہوں گے، کیا وہ بھی ان عام لوگوں کی طرح سالوں قرآن کریم کا صرف لفظی ترجمہ ہی رٹتے رہیں؟

ایسی صورتحال میں یہ لازمی اور مفید ہوگا کہ جب ان میں مناسب صلاحیت کے ساتھ ساتھ وقت کی گنجائش بھی ہوتی ہے تو اُنہیں اس کتابِ حکیم کا مقامی زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اس کی آسان اور مبارک عربی لغت، محاوروں اور استعمالات پر مفید معلومات بھی فراہم کی جائیں اور پھر ان معلومات کو ان کے ذہنوں میں راسخ کرنے اور ان کے عملی استعمالات کی تربیت دینے کی غرض سے ان سے متنوع مشقیں حل کرائی جائیں۔

ہم تعلیم قرآن اور عربی زبان کے اچھے معلم کیوں تیار نہ کرسکے؟

ہماری عظیم درسگاہوں میں کتاب اللہ کی تعلیم وتدریس جس سادہ اور ناقص طریقے پر چلی آرہی ہے اسکے مضر اثرات کی وسعت کا جائزہ لینے کے لئے ان پہلوؤں پر غور کرنا مفید ہوگا:

① ہمارے طلبہ اور طالبات اپنی نوعمری میں پوری لگن اور شوق سے اپنا تعلیمی سفر شروع کرتے ہیں، اس لئے یہ ان کی عمدہ تعلیم، بہتر تربیت اور تخلیقی صلاحیتوں کی اچھی نشو ونما کا سنہری موقعہ ہوتا ہے، اور اُنہیں عربی زبان کو لکھنے اور بولنے کا ابتدائی سلیقہ اور تربیت دینے کا بھی یہی فطری وقت ہوتا ہے، لیکن چونکہ ہماری درسگاہوں میں مروجہ طریقۂ تدریس کا زیادہ

www.KitaboSunnat.com

زور عربی عبارتوں کا لفظی ترجمہ رٹنے اور صرف ونحو کی گردانوں اور قواعد کو استعمالات کے بغیر یاد کرنے پر ہی رہتا ہے، اس لئے ہمارے نہایت ذہین اور محنتی بچے بھی عربی ایسی آسان زبان کو لکھنے اور بولنے کی مشق نہیں کرتے۔ اور وہ قدرتی طور پر اس پہلو میں جمود کا شکار ہوتے ہیں جو آگے جا کر عملی زندگی میں ان کے لئے طرح طرح کی مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس وقت جو طریقۂ تدریس ہمارے ہاں رائج ہے، اس میں طالبعلم سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک پڑھتے ہوئے عربی میں چند صفحات بھی لکھنے کی مشق نہیں کرتا۔

② پھر اس ایک مضمون کے طریقۂ تدریس کی پسماندگی صرف اس ایک مضمون تک محدود نہیں ہے، بلکہ اکثر معلّمین تعلیم وتدریس کے فن سے نا آشنا ہوتے ہیں اور مدارس کی انتظامیہ بھی اُنہیں فن تعلیم میں تربیت اور تدریب کے مواقع فراہم نہیں کرتی، اس لئے وہ اس پرانے طریقۂ تدریس کو آسان اور چلتا ہوا سکہ خیال کرتے ہوئے اپنائے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ہماری درسگاہوں میں اکثر مضامین کی تدریس اسی لفظی اور زبانی ترجمہ اور تشریح تک محدود رہتی ہے اور یہ طرزِ تدریس سالِ اوّل سے لے کر الشهادة العالية اور الشهادة العالمية تک بلکہ اس سے بھی آگے تخصص کی اقسام (تخصص فی التفسیر، تخصص فی الحدیث، تخصص فی الفقہ، تخصص فی الافتاء وغیرہ) اور یونیورسٹی کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کورس میں بھی جاری رہتا ہے۔ یوں کاہلی اور جمود کا یہ متعدی مرض نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

③ ہمارے عربی مدارس اور اسلامی درسگاہوں میں رائج اس ناقص اور مضر طریقۂ تدریس کا ایک وسیع اور قومی سطح کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ یہ درسگاہیں آج تک سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں اور کالجوں میں عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کی معیاری تدریس کے لئے اچھے معلّمین اور اساتذہ تیار نہیں کرسکیں، کیونکہ جن معلّمین نے خود ایسے ماحول میں تعلیم پائی ہوتی ہے، وہ عملی زندگی میں تدریس کے جدید اور ترقی یافتہ انداز اپنانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے: فاقد الشيء لا يُعطيه (جو شخص خود کسی خوبی

www.KitaboSunnat.com

سے محروم ہو، وہ اسے دوسروں کو نہیں دے سکتا)۔ انہی اسباب کی بنا پر ہم قیام پاکستان کے بعد آج تک ماہر معلّمین اور اساتذہ کی تیاری کے اس خلا کو پر نہیں کر سکے۔

اپنا مختصر تعارف

چونکہ زیر بحث مسئلہ ملک بھر کے اسلامی مدارس کے نظامِ تعلیم سے متعلق ہونے کی وجہ سے نہایت اہم ہے اور عمیق غور وفکر کا متقاضی ہے، اس لئے میں اس موقع پر محترم علماء اور اساتذہ کی اطلاع اور اطمینان کے لئے اپنا مختصر تعارف عرض کرنا مفید خیال کرتا ہوں۔

میں یہ گذارشات بتوفیقہ سبحانہ وتعالیٰ تعلیم وتربیت کے میدان میں اپنے طویل تجربات اور غور وفکر کی روشنی میں ان عظیم اسلامی درسگاہوں کو بہتر علمی وتعلیمی ترقی دینے کی غرض سے پیش کر رہا ہوں۔ میں خود متعدد اسلامی درسگاہوں کا بانی ہوں، اور دن رات ان کے بہتر اور ترقی یافتہ نصاب کی ترتیب وتصنیف میں مشغول رہتا ہوں۔ ماضی میں ملت کے جن اکابر علماء اور مفکرین سے میرا کسی طرح کا تعلق رہا ہے، میں ان کی قیمتی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے ہی اسلامی علوم اور عربی زبان کی خدمت کر رہا ہوں۔ ان میں اوّلاً میرے اساتذہ مولانا عبدالغفار حسن، مولانا حافظ محمد محدث گوندلوی، مولانا معاذ الرحمٰن، مولانا عبداللہ امرتسری، مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل اور مولانا مفتی ابوالبرکات مدراسی ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالرحیم اشرف، مولانا مفتی محمد شفیع (ان کی جو تقریر اب 'وحدتِ اُمت' کے عنوان سے چھپتی ہے، اسے اُنہوں نے پہلی بار مولانا عبدالرحیم اشرف کی درخواست پر ہمارے ادارے جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ میں بیان فرمایا تھا، پھر راقم نے اسے کیسٹ سے قرطاس پر منتقل کیا تھا)، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا خلیل احمد حامدی، مولانا عطاء اللہ حنیف نیز مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور احمد نعمانی، اور مُعلِّم الانشاء کے مؤلف مولانا عبدالماجد ندوی اور اسی طرح اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ کے وائس چانسلر اور سعودی عرب کے مفتی اکبر شیخ عبدالعزیز بن باز، الطریقة الجدیدة کے مؤلف ڈاکٹر احمد امین مصری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

رحمهم الله جميعًا وغفر لهم ورفع درجاتهم!

www.KitaboSunnat.com

میں ۱۹۷۳ء کے آخر میں اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں اعلیٰ تربیتی کورس کے لئے گیا تو میرے ہمراہ محترم ڈاکٹر شیر علی اور مولانا محمود اشرف بھی تھے۔ میں اس سے پہلے ہی پاکستان میں عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی جدید نہج پر تدریس کر رہا تھا۔ مولانا عبدالرحیم اشرف کی سرپرستی میں سات آٹھ سال جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ میں بہت عمدہ تجربات ہوئے اور یہیں سے نصابی کتابوں کی تصنیف شروع کی۔ بعدازاں چند ماہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تنظیم اسلامی اور جامعہ اشرفیہ میں عربی زبان کی تدریس کرتا رہا۔ وہاں کے بزرگوں مولانا عبیداللہ، مولانا عبدالرحمٰن اشرفی اور مولانا حافظ فضل الرحیم سب کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا۔

اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے دوران مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی تو ان سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس وقت کے نصابِ تعلیم اور برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان وادب کی اشاعت پر تبادلہ خیال ہوتا۔ وہ اکثر میری سوچ اور جذبہ عمل کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک بار اُنہوں نے حرمِ مکی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''بشیر صاحب! مملکتِ پاکستان میں عربی زبان کے ایک سپاہی کی ضرورت ہے اور وہ آپ ہی ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا سفارت خانے کی ملازمت کو چھوڑ کر پاکستان جایئے۔''

میں پہلے ہی اسی نظریے کو لے کر عالم عرب میں عربی زبان وادب کی ترقی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کی غرض سے سعودی عرب گیا تھا۔ مزید کسی ڈگری یا ملازمت کا حصول میرا مقصد نہ تھا۔ اس سے قبل ان کی تصنیف 'پا جا سراغِ زندگی' پڑھ چکا تھا اور اس سے متاثر تھا، اس لئے ان کی اس رائے سے میرے پرانے تصور کو تقویت ملی۔ چنانچہ میں نے جدہ کے پاکستانی سفارتخانے میں ملازمت کے دنوں میں اقرأ الجزء الاوّل کا مسودہ تیار کرلیا تھا اور الجزء الثانی کی ترتیب جاری تھی۔

آخر میں اپنے مہربان دوست اور تعلیم عربی کے عالمی ماہر جناب ڈاکٹر ف عبد الرحیم مؤلف کتاب دروس اللغة العربية (تین حصے) کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کے ساتھ سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران اور کئی تعلیمی کانفرنسوں میں تبادلہ خیال کا موقع ملا اور ان کے تجربات سے استفادہ کیا۔

www.KitaboSunnat.com

پس چہ باید کرد؟

اسلامی مدارس کے ابتدائی سالوں میں جو طلبہ اور طالبات عربی زبان اور اسلامی تعلیم کے مختلف علوم وفنون پڑھتے ہیں، اُنہیں کتاب اللہ کی تعلیم وتدریس جدید تعلیمی نظریات اور تجربات کے مطابق اور عالمی سطح پر مسلّمہ اور معیاری طریقۂ تدریس کے مطابق کی جائے جس کا خاکہ ذیل میں دیا جارہا ہے..... واللہ الموفق والمستعان !

اوّلاً: اس مضمون کا موجودہ عنوان 'ترجمہ قرآنِ کریم' بدل کر اسے تعلیم القرآن الکریم یا تدریس القرآن الکریم کا نام دیا جائے۔

ثانیاً: ان طلبہ اور طالبات کے لئے تدریس القرآن الکریم کے ہر سبق میں درج ذیل تین اجزا یا حصے ہوں گے:

١ . شرح الكلمات ٢ . ترجمة الآيات وشرحها ٣ . المناقشة

أ. شرح الكلمات: معلم ہر سبق کے شروع میں اس کی مقررہ آیاتِ کریمہ کے الفاظ اور تراکیب کی لغوی تشریح کو تختۂ سیاہ پر لکھے تاکہ بچے اسے اپنی کاپیوں میں درج کریں۔ اس جز کے تیس (۳۰) نمبر ہوں گے۔

2. ترجمة الآيات وشرحها: بعد ازاں معلم ان آیاتِ کریمہ کا مقامی زبان میں ترجمہ کرے گا اور بچوں کے معیار کے مطابق ان کی تشریح کرے گا۔ اس ترجمہ کے پچیس (۲۵) نمبر اور تشریح کے پندرہ (۱۵) نمبر ہوں گے۔ یوں اس جز کے کل چالیس (۴۰) نمبر ہوں گے۔

3. المُناقشة: آخر میں معلم ان آیاتِ کریمہ کے جملوں اور مضمون پر زیر تعلیم بچوں کے معیار کے مطابق آسان عربی زبان میں سوالات تختۂ سیاہ پر لکھے گا اور بچے ان سوالات کے عربی میں جواب دینے کی زبانی مشق کریں گے اور بعد میں ان سوالات اور ان کے جوابات کو اپنی کاپیوں میں لکھیں گے۔ اس جز کے تیس (۳۰) نمبر ہوں گے۔

❶ مجوزہ تبدیلیاں

ملکی درسگاہوں میں کتاب اللہ کی ایسی معیاری اور جامع تدریس کے لئے ہمیں اس کے موجودہ طریقۂ تدریس میں درج ذیل دو بڑی تبدیلیاں کرنا ہوں گی:

www.KitaboSunnat.com

① **قرآنِ کریم کے الفاظ کی لغوی تشریح کو بہتر اور منظم اُسلوب میں پڑھایا جائے:** اس وقت ترجمہ قرآنِ کریم پڑھاتے ہوئے اکثر معلّمین قرآنی الفاظ کی جو تشریح کرتے ہیں، وہ بہت کم اور سرسری ہوتی ہے، اور وہ بھی اکثر زبانی بتا دی جاتی ہے اور بچوں کو املا نہیں کرائی جاتی، اِلا ما شاء اللہ۔ اس لئے اس سے زیرِ تعلیم بچوں کے ذہنوں میں لغوی معلومات کو راسخ کرنے میں چنداں مدد نہیں ملتی۔ یہ سلسلہ بہرحال کم سن بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مفید ہے۔ اس لئے اسے زیادہ مؤثر اور منظّم صورت دینے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے دو باتوں کو واضح اور متعین کرلیا جائے۔

۱۔ ان مطلوبہ لغوی معلومات کا دائرہ متعین کرلیا جائے۔ اور

۲۔ پھر اُنہیں جماعت کے طلبہ کو پیش کرنے کا طریق کار واضح کردیا جائے۔

1. مطلوبہ لغوی معلومات

۱. شروع میں صرف مشہور اور کثیر الاستعمال عربی افعال کا ماضی، مضارع، مصدر اور معنی بتائے جائیں۔

۲. اگر آیتِ کریمہ میں اسم مفرد استعمال ہوا ہے تو اس کا معنی اور جمع بتائی جائے، اور جمع کی صورت میں اس کا معنی اور مفرد بتایا جائے، وغیرہ۔

جبکہ دو تین پارے پڑھنے کے بعد ان میں درج ذیل معلومات کا اضافہ کرلیا جائے:

۱. مشہور افعال کے صلات یعنی ان حروفِ جر کا بتایا جائے جو ان افعال کو متعدی بنانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً قال کے بعد لِ کا استعمال مثلاً وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ

۲. قرآنِ کریم میں مستعمل متضاد کلمات نیز مترادف کلمات بتائے جائیں۔

۳. اس مرحلے پر نسبتاً مشکل افعال اور اسماء کی تشریح بھی کی جائے۔

۴. لغتِ قرآن، صرف ونحو نیز علم بلاغت کی آسان اور عام فہم دیگر ایسی معلومات جنہیں معلم بچوں کے معیار کے مطابق مناسب تصور کرے، بھی لکھوائی جائیں۔

(مزید راہنمائی اور نمونے کے لئے دیکھئے: دلیل قصص النّبیین، جزاوّل، دوم اور سوم)

www.KitaboSunnat.com

2. طریق کار

ان لغوی معلومات کو بچوں کو اس طریقے پر پڑھایا جائے:

۱. معلم سبق پڑھانے سے قبل مقررہ آیات کے منتخب الفاظ کی تشریح تیار کر کے لائے۔

۲. اور وہ اسے درس کے شروع میں بچوں کے سامنے تختۂ سیاہ پر لکھے۔

۳. اور بچے اسے آواز سے پڑھتے ہوئے یاد کریں اور اپنی کاپیوں میں لکھیں۔

۴. اور معلم اس امر کا اہتمام کرے کہ تمام بچے ان معلومات کو اپنی اپنی کاپیوں میں لکھیں۔

② **عربی زبان کے استعمالات اور سوال وجواب کی مؤثر تربیت دی جائے:** قرآنِ کریم کی عربی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے۔ اس کے الفاظ سہل اور عام فہم ہیں اور زیادہ تر چھوٹی چھوٹی ترکیبات، مختصر جملے اور میٹھے میٹھے بول ہیں۔ پھر اہل زبان کے ہاں انتہائی معروف ومشہور محاورے اور استعمالات، اور اُسلوبِ بیان اس قدر عام فہم کہ اوسط درجے کا قاری اسے بخوبی سمجھ لے۔ اس کی اس خوبی کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۞ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۞ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء:۱۹۲ تا ۱۹۵)

نیز فرمایا ﴿وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (النحل:۱۰۳)

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم عجمی مسلمان ہیں اور ہماری مادری اور قومی زبان عربی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے بچے قرآنِ کریم کی عبارت کو براہِ راست عربی میں نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن ہم اپنی اس کمزوری کے اِزالے کی خاطر اپنے زیر تعلیم بچوں کو قرآنِ کریم کے ابتدائی فہم کے لئے ① اس کے الفاظ، ترکیبوں، اور مشہور محاوروں اور استعمالات کی مناسب تشریح اور معنی یاد کراتے ہیں۔ نیز ② اُنہیں اس کی آیاتِ کریمہ کا پورا ترجمہ پڑھاتے ہیں۔ تو اب ان کے لئے کتاب اللہ کے ابتدائی فہم ومطالعہ کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ پھر ③ اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ وہ ایک دینی درسگاہ کے طلبہ اور طالبات ہیں اور ابتدائی عربی زبان (نثر ونظم) کے کئی اسباق نیز علم صرف، علم نحو اور دوسرے کئی ایسے مضامین پڑھ رہے ہیں جو عربی زبان کے فہم اور استعمال میں معاون اور خادم ہیں۔ اس لئے اب وہ قرآنِ کریم کے اسباق میں ابتدائی سطح کی

www.KitaboSunnat.com

آسان عربی زبان میں سوال وجواب اور دیگر ایسی مشقوں کو حل کرنے کی اچھی قدرت رکھتے ہیں، جو ان کی مزید علمی اور لسانی ترقی میں معاون بنیں گی۔

اس لئے اس مرحلے پر معلم قرآنِ مجید کی آیاتِ کریمہ کے مضمون اور جملوں پر آسان عربی میں سوالات تیار کرے اور اُنہیں تختہ سیاہ پر لکھے۔ بچے اُنہیں سمجھیں اور پھر عربی میں ان کے جوابات بولیں۔ جہاں ضرورت ہو تو معلم ان کی مدد کرے۔ بعد میں بچے سوال وجواب کی ایسی مشقوں کو اپنی کاپیوں میں لکھیں گے اور معلم ان کی تصحیح کرے گا۔

جبکہ اس کورس کے تیسرے اور چوتھے سال میں طلبہ سبق کی مقررہ آیات کا عربی زبان میں مختصر خلاصہ بھی پیش کیا کریں گے۔

❹ سورۂ فاتحہ کی تدریس کی مثال

اب میں اپنی معروضات کو مزید واضح کرنے کے لئے اس مجوزہ تدریسی خاکے کے مطابق سورۂ فاتحہ کی تدریس کی مثال پیش کرتا ہوں:

1. **شرح الکلمات:** معلم سبق کے شروع میں سورۂ فاتحہ کے الفاظ کی درج ذیل تشریح کو تختۂ سیاہ پر لکھے گا جسے طلبہ مناسب آواز سے پڑھتے ہوئے اپنی کاپیوں میں لکھیں گے۔

أَعُوْذُ میں پناہ مانگتا ہوں	عَاذَ يَعُوْذُ عَوْذًا وَّعِيَاذًا پناہ مانگنا
بِاللهِ اللہ کی	مِنْ سے الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ راندہ ہوا شیطان
بِسْمِ نام سے (اصل میں بِاسم تھا)	
الرَّحْمٰنِ بہت زیادہ رحم کرنیوالا	الذي يرحم كل شيء
الرَّحِيْمِ سدا رحم کرنے والا	الذي يرحم دائمًا وأبدا
اَلْحَمْدُ سب تعریفیں	حَمِد يَحْمَد حَمْدًا تعریف کرنا
رَبِّ پروردگار جمع أرباب	الْعَالَمِيْنَ جہانوں مفرد عالَم
يَوْمِ دن جمع أيّام	الدِّيْنِ بدلہ إِيَّاكَ صرف تیری ہی
نَعْبُدُ ہم عبادت کرتے ہیں	عَبَد يعبُد عبادةً عبادت کرنا
نَسْتَعِيْنُ ہم مدد مانگتے ہیں	استعان يستعين استعانة مدد مانگنا

www.KitaboSunnat.com

اِهْدِنَا آپ ہماری رہنمائی کریں هَدٰى يَهدِي هُدًى رہنمائی کرنا
الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سیدھی راہ وهو سبيل الأنبياء والمرسلين
أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ جن پر تو نے انعام کیا أَنْعَمَ يُنْعِمُ إِنْعَامًا انعام کرنا
غَيْرِ وہ لوگ نہیں الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ جن پر غضب ہوا
الضَّالِّيْنَ گمراہ لوگ آمِيْن قبول فرما

2. **ترجمة الآيات:** پھر معلم جماعت کو اپنی مقامی زبان میں ترجمہ پڑھائے گا اور زیر تعلیم بچوں کے معیار کے مطابق اس کی تشریح کرے گا۔

3. **المناقشة :**

التمرين الأول: اب تیسرے مرحلے پر معلم تختۂ سیاہ پر سورہ فاتحہ کے بارے میں عربی میں درج ذیل سوالات لکھے گا جنہیں طلبہ مناسب آواز سے پڑھتے ہوئے اپنی کاپیوں میں درج کریں گے:

١ . لمن الحمد؟ (الحمد لله)
٢ . من ربُّ العالمين؟
٣ . من رب الإنسان؟
٤ . من ربّ الحيوان؟
٥ . من رب السَّمٰوات؟
٦ . من رب الأرض؟
٧ . من الرحمٰن؟
٨ . من الذي يرحم كل شيء؟
٩ . من الرحيم؟
١٠ . من الذي يرحم دائمًا وأبدًا؟
١١ . من نعبد؟
١٢ . من نستعين؟
١٣ . من يهدينا الصراط المستقيم؟
١٤ . من يجيب دعائنا؟

سوالات کی تحریر سے فراغت کے بعد معلم جماعت کو ان کے عربی میں جواب دینے کی مشق کرائے گا اور حسبِ ضرورت ان کی مدد بھی کرے گا۔ بعد میں بچے سوال وجواب کی اس مشق کو اپنی کاپیوں میں حل کر کے لائیں گے جنہیں معلم چیک کر کے ضروری تصحیح کرے گا۔

التمرين الثاني: اب معلم طلبہ سے کہے کہ وہ اپنی کاپیوں میں الحمد للہ کی طرح کے عربی میں دس جملے لکھیں، مثلاً

www.KitaboSunnat.com

١ . الحمد لله ٢ . التحيات لله

٣ . الشكر لله ٤ . الأرض لله وغیرہ

معلم کے لئے مزید مشق: اگر معلم چاہے اور وقت کی گنجائش موجود ہو تو طلبہ کو کہے کہ وہ اوپر کی مشق میں اپنے تمام عربی جملوں کے ترتیب وار سوالات بنائیں اور ان کے سامنے جوابات لکھیں، مثلاً

١ . لِمَن الحمد؟ ٢ . لمن التحيات؟ وغیرہ

خلاصہ: آپ دیکھ رہے ہیں کہ الحمدللہ ان آسان مشقوں کو حل کرتے ہوئے بچے قرآنی عربی زبان کے پچاس ساٹھ جملے بآسانی لکھ اور بول رہے ہیں۔

❸ بحث کے نتائج

① اس وقت اسلامی مدارس میں تعلیم قرآن کریم کا مروّجہ طریقۂ تدریس (ترجمہ قرآنِ کریم) اس کی تعلیم وتدریس کے صرف چالیس فیصد (۴۰) مقاصد کو پورا کر رہا ہے جبکہ ساٹھ فیصد (۶۰) مقاصد کو نظرانداز کرتا ہے، اس بنا پر ہمارے طلبہ اور طالبات کی تعلیم وتربیت کے کئی اہم گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔

② قرآنِ کریم کی عربی زبان اور اُسلوبِ بیان نہایت آسان اور پرکشش ہونے کے باوجود ہمارا طریقۂ تدریس اور معلّمین زیر تعلیم بچوں کو ان کے عملی استعمال اور لکھنے بولنے کی تربیت نہیں دیتے جس کے نتیجے میں وہ اپنی نوعمری میں اس نقص سے برا اثر لیتے ہوئے جمود کا شکار ہوجاتے ہیں۔

③ اپنے طلبہ اور طالبات کی بہتر اور معیاری تعلیم وتربیت کے لئے اس ناقص طریقۂ تدریس کی فوری اصلاح کرتے ہوئے اسے جدید تعلیمی تجربات اور تحقیق کے مطابق از سرنو ترتیب دینا ضروری ہے۔

④ اگر ہم اپنی درسگاہوں کے اس طریقۂ تدریس کی مناسب اصلاح اور ترقی کا اہتمام کرلیں تو ان کے طلبہ اور طالبات کی علمی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان درسگاہوں کا مقام اور وقار بڑھے گا۔

www.KitaboSunnat.com

⑤ اور ان کے فضلا کے لئے اندرون وبیرون ملک مختلف میدانوں میں کام اور ترقی کے وسیع اور اچھے مواقع میسر ہوں گے، اور وہ چھ یا آٹھ سالہ تعلیمی کورس مکمل کرنے کے بعد نہیں، بلکہ صرف تین سالہ کورس کرنے کے بعد بھی عربی زبان اور اسلامیات کے اچھے معلم ثابت ہوں گے، نیز وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے عرب دنیا کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کے اہل ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ وھو المُوَفِّق والمُستعان !

❹ تقاضے اور ضروریات

کما لا یخفٰی علی السادۃ العلماء والمدرّسین قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس کو ترقی دینے کی اس تجویز پر اگر صدقِ دل اور محنت سے عمل کیا گیا تو یہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری عظیم اسلامی درسگاہوں کے نصابِ تعلیم، طریقۂ تدریس اور مجموعی ماحول میں ایک مثبت اور تعمیری انقلاب کا ذریعہ بنے گی، اور ان کے اسلامی اور ملی کردار اور عظمت میں اضافہ ہوگا۔ اس لئے محترم علماء اور مدرسین کو کتاب اللہ اور دوسرے علومِ شرعیہ کی تدریس میں موجود اس دیرینہ نقص کا فوری اِزالہ کرتے ہوئے اپنے طلبہ اور طالبات کی زیادہ معیاری تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس اصلاحی مہم میں ایسے حضرات کو مؤثر کردار ادا کرنا چاہئے جو ان عظیم اسلامی درسگاہوں کے ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں، خصوصاً وہ حضرات جنہوں نے الجامعۃ الإسلامیۃ العالمیۃ اسلام آباد، الجامعۃ الإسلامیۃ مدینہ منورہ اور مکہ، ریاض یا قاہرہ وغیرہ کی دوسری یونیورسٹیوں اور اداروں سے کسبِ فیض کیا ہے۔

البتہ اس تجویز کے مناسب اور مؤثر نفاذ کے لئے دو چیزوں کی فوری ضرورت ہوگی:

① قرآنِ کریم کی ایسی تدریس میں معلّمین اور طلبہ وطالبات کی رہنمائی اور مدد کے لئے مناسب دلیل یا مرشد المُعلم (teacher's guide) کی تیاری۔ الحمدللہ معھد اللغۃ العربیۃ میں اس کی تیاری اور تصنیف پر چند سالوں سے کام جاری ہے۔

② قرآنِ کریم کی اس نہج پر تعلیم وتدریس کی رہنمائی کیلئے معلّمین اور معلّمات کو کم از کم دو ہفتے کی تعلیمی تربیت دی جائے۔ یہ عملی تربیت وفاق کی سطح پر بھی دی جاسکتی ہے۔ وفاق المدارس السّلفیہ نے گذشتہ ماہ (۲۶/اپریل تا یکم مئی ۲۰۰۸ء) فیصل آباد میں ۱۵۰ معلّمین

www.KitaboSunnat.com

اور معلّمات کی تربیت کا پہلا کورس مکمل کراتے ہوئے اس میدان میں پہل کر دی ہے۔ ان عظیم مقاصد کی تکمیل کے لئے ایسے تربیتی کورسز کے انعقاد سے ہماری درسگاہوں کی بہتر تعمیر و ترقی کے راستے کھلیں گے اور ان کے فضلا کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر زیادہ پذیرائی حاصل ہوگی۔ ان کورسز کے انعقاد کیلئے موجودہ حکومت اور جامعة الدُّوَل العربية (عرب لیگ) سے مناسب مالی اور فنی امداد بھی لی جاسکتی ہے...... ان شاء اللہ تعالیٰ

باپ نے حج نہیں کیا، بیٹا اس کی زندگی میں حج کرسکتا ہے؟

سوال: باپ حیات ہو اور اُس نے حج نہ کیا ہو تو کیا ایسی صورت میں بیٹا حج کرسکتا ہے؟

جواب: اگر بیٹا باپ سے علیحدہ ہو تو اس کی کمائی الگ ہو تو وہ اپنے روپے سے حج کرسکتا ہے اور اس کا حج صحیح ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (آلِ عمران:۹۷)

''اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگوں پر حج (فرض) ہے جو بیت اللہ شریف کی طرف پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔''

بیٹا چونکہ اپنے مال سے بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہے لہٰذا اس آیت کی رُو سے اس کے ذمہ حج ضروری ہے۔ رہا یہ سوال کہ بیٹے کی کمائی باپ کی ہے، تو یہ اس صورت میں ہے کہ باپ محتاج ہو جائے اور اپنا خرچ نہ اُٹھا سکے تو بیٹے کے مال سے بقدرِ ضرورت لینے کا حقدار ہے، نہ یہ کہ بیٹے کے مال کا باپ حقیقتاً مالک ہے اور حدیث میں جو الفاظ «أنتَ و مالك لأبيك» آئے ہیں، ان کا یہی معنی ہے کہ باپ بیٹے کے مال سے اپنی ضرورت پوری کرسکتا ہے۔ اگر وہ خود بیٹے کے مالک ہوتا تو وراثت میں چھٹا حصہ کیوں لیتا؟ اگر سائل کا یہ مطلب ہے کہ کمائی باپ کی ہے اور مالک باپ ہے اور بیٹا ویسے ہی بطورِ اولاد ہونے کے باپ کے تحت کام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ باپ ہی بیٹے کو حج کرائے، جو درست نہیں۔

اگر باپ نے اپنا حج نہ کیا ہو تو بیٹے کا حج ہو جائے گا لیکن باپ کے ذمہ رہے گا۔ اگر زندگی میں حج کر لیا تو اس کے ذمہ سے اُتر گیا ورنہ جو وعید تارکِ حج کے لئے ہے یعنی یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر، تو باپ اس کا مستحق ہوگا۔ (فتویٰ حافظ عبداللہ محدث روپڑی: ج ۲/ص ۵۷۷)

www.KitaboSunnat.com

تعلیم وتعلّم

سلیم منصور خالد

'او' لیول کی اسلامیات میں فرقہ واریت

جب سے انگریز بہادر نے اس خطے پر قبضہ جمایا ہے، تب سے ہمیں وہی چیز پسند آتی ہے جسے انگریز یا انگریزی سے نسبت ہوتی ہے۔ دیگر باتیں تو ایک طرف، ہمارے ہاں اپنی ذاتی پہچان کے حوالے 'دستخط' تک انگریزی ہی میں ثبت کرنا تہذیب وشائستگی قرار پائے۔ کچھ یہی حال تعلیم کا ہے۔ کبھی تعلیمی معیار کی علامت عیسائی مشنری تعلیمی ادارے تھے، اور ابھی تک ہم اسی جادو کے اسیر تھے کہ اب اس کے ساتھ 'اے' لیول اور 'او' لیول کا برطانوی امتحانی نظام (GCE) بھی ہمارے ذہنوں پر بھوت بن کر مسلط ہوگیا ہے۔ جس فرد کے پاس چند ہزار روپے فاضل ہیں یا جو شخص واقعی 'اسٹیٹس' (status) کے بارے میں حساس ہے، اس کے قدم خود بخود انہی اداروں کی جانب اُٹھ جاتے ہیں۔ آج پاکستان کا قومی تعلیمی نظام کس کسمپرسی سے دوچار ہے، اس کا اندازہ جی سی ای نظام کے بڑھتے ہوئے رجحان سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

گذشتہ چند برسوں کے دوران میں پاکستان پر مسلط فوجی حکمرانوں نے بظاہر ناصحانہ، مگر دراصل بے جا طور پر یہ طوفان اُٹھائے رکھا کہ ''اسلامیات کی کتاب میں فرقہ واریت ہے، ہمیں ایمانیات اور تاریخ کے بجائے زندگی کے معاملات پر اسلامی سوچ طالب علموں میں منتقل کرنی ہوگی اور اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوگا'' ساتھ ہی ایک جرنیلی وزیرِتعلیم نے یہ بھی فرمایا کہ ''قرآن کے ۴۰ پارے ہوتے ہیں۔'' کچھ لوگوں نے اسے جنرل موصوف کی لغزش زبان (slip of tongue) قرار دیا، مگر کچھ لوگوں کے بقول: یہ بات ویسے ہی نہ کہی گئی تھی بلکہ اس کے پیچھے ایک نظامِ فکر کا دباؤ (push) بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوسکتا ہے۔ بہرحال قومی نظامِ تعلیم اور قومی نصابِ تعلیم پر چار حرف بھیجنے والے فوجی حکمرانوں اور ان کے پشت پناہ مغرب زدہ لوگوں کی یہ ہوشیاری زیادہ دیر تک اپنا رنگ نہ جما سکے گی۔

www.KitaboSunnat.com

اس وقت ہمارے پیش نظر ایک کتاب ہے، جس کا نام ہے Islamiat for Students۔ اس کتاب کے 'تعارف' اور 'دیباچے' کے مطابق یہ 'او' لیول کے طالب علموں کے لیے تیار کی گئی ہے، فیروز سنز لاہور نے اسے شائع کیا ہے، ۲۰۰۹ء میں بطورِ نصاب یہ نافذ العمل ہوگی اور اس کی مصنفہ کا نام فرخندہ نور محمد ہے، جب کہ قیمت ۱۷۵ روپے ہے۔ اعلیٰ طبقاتی نظامِ تعلیم میں میٹرک کی سطح کے پاکستانی طلبہ وطالبات میں اس کتاب کے طفیل کون سی فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی اور اُنہیں اسلامی تاریخ کے بارے میں کس درجہ یکسوئی نصیب ہوگی، آیندہ سطور میں اسی حوالے سے کچھ معروضات پیش کی جارہی ہیں۔

مصنفہ نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے: ''میٹرک اور 'او' لیول کی سطح کے طالب علموں کے لیے اسلامیات کی یہ کتاب اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ طرزِ تحریر براہِ راست اور عام فہم ہو، اور وہ تمام لوگ جو اسلام کی پیدایش (birth) اور پھیلاؤ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، اُنہیں اس میں معلومات ملیں۔ اس کتاب میں دلچسپ مواد پیش کیا گیا ہے۔ بہت سی اصطلاحیں اور واقعات دانستہ طور پر دہرائے گئے ہیں، تاکہ عام سطح کا بچہ ان سے مانوس ہوجائے''۔۔۔

ہر مصنف کسی نہ کسی دعوے کے ساتھ کتاب تحریر کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہاں پر بھی مصنفہ کے اس حق کو تسلیم کرنے کے باوجود، حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ بعثتِ نبویؐ کو 'اسلام کی پیدایش' قرار دے رہی ہیں، حالانکہ اسلام تو آدم علیہ السلام سے لے کر تمام انبیا علیہم السلام کے ہاں ایک تسلسل، روایت اور پختہ ایمان کے طور پر موجزن رہا ہے۔ اس لیے اسلام کی 'پیدایش' کو خاتم الانبیا ﷺ سے منسوب کرنا، اس قرآنی حکم سے مناسبت نہیں رکھتا، جس میں فرمایا گیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہا: ''اے میرے بچو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے، لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔'' (البقرۃ:۱۳۲) یہ اور دیگر بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ماقبل کے انبیا علیہم السلام کو مسلم ہی کہا یا اسلام سے وابستہ بیان فرمایا۔ اس لیے محض اس ایک لفظ 'پیدایش' کی لغزش خود ایمان کے بنیادی عناصر تک کو خلط ملط کردیتی ہے، مگر فاضلہ اس مقام سے یوں ہی گزر جاتی ہیں۔

یاد رہے اسلامیات کی یہ کتاب مصنفہ نے نظرثانی کے بعد پانچویں ایڈیشن کے طور پر

www.KitaboSunnat.com

شائع کی ہے، اورنظرثانی کے دوران میں جن ابواب کوکتاب سے خارج کیا گیا ہے، وہ ہیں: اسلام اور معاشرتی زندگی، اسلامی اخلاقیات (شائستگی، احترام،نظم، عدل وانصاف)، اسلام اور انسانوں کے حقوق وغیرہ ـــ اس کے بجائے جومواد شامل کیا گیا ہے، وہ ہے: اسلام کی سیاسی تاریخ،شیعہ عقائد کے حوالے سے اُمور۔

یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ روشن خیالی اور جدیدیت کے علَم برداروں نے اسلامیات کے قومی نصاب پرفرقہ واریت کا الزام دھرتے ہوئے اسے تلپٹ کرنے کا اہتمام کیا ہے، مگر اپنے ممدوح نصابِ تعلیم میں شیعہ سُنّی فرقہ واریت پرمبنی لوازمہ غیرمناسب اور غیرمتناسب انداز سے پیش کیا ہے، اور وہ بھی ۱۳ سے ۱۶ سال کی عمر کے بچوں کے نصاب میں، جوعمر کے اس حصے میں ایسے اختلافی اُمور سے بالاتر ہوتے ہیں، یا اُنہیں عملی طور پر اس تفریق سے بالا رکھنا ضروری ہے۔ اس طرح یہ نظرثانی شدہ کتاب اسلامی اخلاقیات اور اس کی روح کو نظرانداز کر کے فرقہ وارانہ اختلاف کی بنیادوں کو گہرا کرنے کا سامان مہیا کرتی ہے۔

قرآن کی تفسیر کا تذکرہ پڑھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ کے بقول: ''یہ عربی لفظ fasara سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے: تشریح کرنا۔'' (ص ۳۳) فسارا یا فصارا یا فثارا، تینوں لفظ ناقابلِ فہم ہیں۔ اگر یہ عربی لفظ فَسَّرَ ہے تو پھر اس کی انگریزی اِملا درست نہیں۔

اس کتاب کے مندرجات میں موجود خوبیوں اور فنی کمزوریوں پر گفتگو سے زیادہ اہم نکتہ وہی ہے جسے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کہتے ہیں، اور یہی چیز اس میں تشویش کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یہ مندرجات شیعہ علما نے کتاب میں شامل نہیں کرائے، لیکن جب ان پر بحث اُٹھ کھڑی ہوگی تو پھر لامحالہ اُنہیں درمیان میں آنا پڑے گا۔ اگرچہ وہ مناظرے کے اس اسٹیج کو تیار کرنے کے ذمہ دار نہیں۔ اب دیکھئے: کتاب کا حصہ چہارم اور باب سوم۔

باب سوم کا عنوان ہے: 'امامت'۔ امامت محض ایک لفظ نہیں، اس کا ایک مخصوص پس منظر ہے، اس کا تعلق تاریخ کی ایک خاص تعبیر سے ہے، یہ لفظ محض واقعاتی تعبیر ہی پر منتج نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق عقیدے، ایمان اور اَفکار سے بھی جڑتا ہے۔ یہی چیز بہ اندازِ دگر اس باب میں زیربحث آئی ہے۔ دسویں جماعت کے بچوں کے سامنے اور وہ بھی اکثر سُنّی طالب علموں کے

www.KitaboSunnat.com

سامنے یہ بیان کرنا کہ

''شیعہ، حضرت علیؓ اور ان کے خلفا کے حق جانشینی کی وکالت کرتے ہیں......شیعہ عقیدے کے مطابق 'امامت' ایک قطعی استحقاقی (prerogative) منصب ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے رحلتِ نبویؐ سے قبل ہی ایک فرد سرفراز (bestowed) فرما دیا تھا، اور پھر یہ منصب امامت دوسرے جانشینوں تک منتقل ہوتا گیا، لیکن اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ [عمر میں] سب سے بڑا ہو، بلکہ روحانی طور پر پاک دامن ہو''۔ شیعہ مسلمانوں کے نزدیک رسولِ کریمؐ نے روحانی میراث حضرت فاطمہؓ کے ذریعے، حضرت علیؓ اور ان کے جانشینوں کے سپرد کردی تھی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی ہدایت کے مطابق حضرت علیؓ پہلے خلیفہ راشد اور امام المومنین تھے...... اِثنا عشریہ یا ۱۲ والے (twelevers) اہلِ تشیع کا ایک اہم فرقہ ہیں، جو ۱۲/اماموں کی جانشینی اور روحانی قیادت پر ایمان رکھتے ہیں۔ رسولِ کریمؐ اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان ۱۲/اماموں کو شامل کرکے اُنہیں ۱۴ معصومین کہا جاتا ہے۔'' (ص ۱۱۱)

اس پیراگراف میں موجود معلومات کیا فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ بچوں میں فرقہ وارانہ تقسیم کے ساتھ ہی ساتھ، خود خلفاے راشدینؓ کے بارے میں شک کا بیج بونا تعلیمی ضرورت کے اعتبار سے کس حد تک درست ہے۔ پیراگراف کے الفاظ خود ہی نازک اُمور کی نشان دہی کرتے ہیں، اور اس مضمون میں اُنہیں کھول کر بیان کرنا شاید مناسب نہیں ہے۔

اسی درسی کتاب کے اگلے صفحے پر درج ہے: ''آخر کار ۱۲ ہزار جوانوں پر مشتمل فوج نے کوچ کیا۔ امام حسنؓ نے کندی قبیلے کے سردار کی قیادت میں ۴ ہزار مردوں کی مہم 'انبہ' بھیجی، لیکن امیر معاویہؓ نے اس کو گورنری کے وعدے کی رشوت دے کر (bribed) ہم نوا بنا لیا۔ جب امام حسنؓ نے یہ خبر سنی تو اُنہوں نے بنومراد سے ۴ ہزار جوانوں کا فوجی دستہ روانہ کیا، لیکن امیر معاویہؓ نے اس کو بھی ساتھ ملا لیا۔'' (ص ۱۱۲)

ذہن میں رکھا جائے کہ حضرت امیر معاویہؓ نہ صرف صحابی ہیں بلکہ کاتبِ وحی بھی ہیں۔ ان کے سیاسی اقدامات یا سیاسی حکمتِ عملی کیا تھی؟ ان کی کمزوریاں اور ما بعد اثرات کیا تھے؟ یہ چیزیں بڑی کلاسوں میں زیرِ بحث آئیں تو طالبِ علم کے سامنے دیگر اُفق بھی نمایاں ہو سکتے ہیں مگر یہاں اس عمر کے بچے کے سامنے صحابہ کرامؓ کے درمیان (نعوذ باللہ) رشوت ستانی یا دھوکا

www.KitaboSunnat.com

دہی کے واقعات کو اس طرزِ بیان کے ساتھ پیش کرنا، فکری انتشار یا مخصوص نقطۂ نظر کی ترویج کے سوا کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ یہی وہ نازک موڑ ہیں جہاں ملک کا پُرسکون ماحول بے جا بحثوں اور فرقہ واریت کے فتنے کو آگ دکھانے کی نذر ہوتا ہے۔ اعلیٰ طبقاتی اور 'شان دار تعلیمی اداروں' میں ان اَسباق کا آخر مطلب کیا ہے؟

بابِ سوم میں: ① حضرت علیؓ، ② امام حسنؓ، ③ امام حسینؓ، ④ امام زین العابدینؒ، ⑤ امام محمد باقرؒ، ⑥ امام جعفر صادقؒ، ⑦ امام موسیٰ کاظم، ⑧ امام علی رضا، ⑨ امام محمد تقی، ⑩ امام محمد نقی اور ⑪ امام حسن عسکری پر تعارفی نوٹ دینے کے بعد ۱۲ویں امام کی حیثیت سے امام محمد مہدی پر دو پیراگرافوں میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان کے مضمرات بھی اپنی دلیل آپ ہیں۔ چونکہ ان تفصیلات کا تعلق ایک مکتبِ فکر کے عقیدے سے ہے، اس لیے ذیل کی عبارت کو صرف دو سوالات کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے:

''امام محمد مہدی ۲۵۵ ہجری کو عراق میں پیدا ہوئے۔ 'محمد' اصل، جب کہ مہدی ان کا خاندانی نام تھا۔ ان کی والدہ رومی شہنشاہ کی پوتی تھیں۔ شیعہ کے نزدیک مہدی کے نام کا حصہ 'منتظر'، 'حجۃ' اور 'قائم' بھی ہے۔ ان کی پیدایش کی خبر خفیہ رکھی گئی اور وہ اپنے والد کی رحلت تک ان کی نگہداشت میں رہے۔ اُنہیں عام لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ رکھا گیا، اور اُنہیں ان کے والد کے چند ساتھیوں کے سوا کسی نے نہ دیکھا۔ والد کی رحلت کے وقت وہ پانچ برس کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد محمد مہدی 'امام' بن گئے اور ساتھ ہی نظروں سے اوجھل (occultation) ہوکر غیابت میں چلے گئے۔ غیابت کے اس زمانے میں وہ اپنے نائبوں (deputies) کے ذریعے رہنمائی کرتے رہے اور محض خاص حالات میں ظاہر ہوتے رہے۔ ۳۲۹ ہجری کے بعد سے ان کی جانب سے رہنمائی موصول نہیں ہوئی۔ یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے پردے میں چلے گئے ہیں اور اس وقت تک پردے ہی میں رہیں گے جب تک کہ اللہ چاہے۔ وہ اس وقت دنیا میں ظاہر ہوں گے، جب یہ دنیا ناانصافی اور گناہ سے بھر جائے گی۔ وہ اسلام کی دعوت دیں گے، دجال سے لڑیں گے، اسے قتل کریں گے اور اللہ کا حکم اس زمین پر نافذ کردیں گے۔ وہ پوری دنیا پر حکمرانی کریں گے اور عدل قائم کریں گے اور ناانصافی کا خاتمہ کردیں گے۔'' (ص ۱۱۸)

www.KitaboSunnat.com

۱۳ برس کے بچے کے ذہن میں یہ پیراگراف بہت سے سوال اُٹھاتا ہے، جنھیں زیر بحث لانے کے بجائے اصل مقدمہ یہ ہے کہ وہ مسلمان جو اس عقیدے کو اپنا جزوِ ایمان نہیں سمجھتے، ان کے لیے ایک طرف 'امامت' بطورِ عقیدہ قبول ہے، مگر دوسری جانب یہ سوال تو اُٹھے گا کہ امامت نے پہلے چار سو سال تو اُمت کی رہنمائی کی، مگر بعد کے ایک ہزار میں رہنمائی و دست گیری کا وہ ادارہ کیوں معطل ہوگیا؟ اس ادھیڑبُن میں وہ استاد جس کی طبیعت اس تفصیل کو منطقی سطح پر ماننے سے انکار کرتی ہے، (لازماً طلبہ اور اساتذہ کی بڑی تعداد تو انہی خیالات کے حاملین پر مشتمل ہوگی) جب وہ دونوں مل کر کلاس روم میں بحث، مناظرے اور سوال و جواب کے گرداب میں پھنسیں گے تو خود سوچ لیجیے، اس میں اسلامیات کا یہ مضمون کہاں گم ہو جائے گا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا روشن خیال مشرف نامہ کس بارگاہ میں سرخرو ہوگا؟

آگے چل کر ایک بار پھر حضرت امیر معاویہؓ کی شخصیت کے بارے میں ایک غلط تاثر پیش کیا گیا ہے:

> ''حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دوران میں، امیر معاویہؓ کو شام کا گورنر بنا دیا اور حضرت عثمانؓ نے ان کی گورنری کو برقرار رکھا۔ حضرت علیؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں اُنہیں منصب سے معزول کرنا چاہا، مگر معاویہؓ ان کی مخالفت پر اُتر آئے اور ان کے خلاف جنگِ جمل اور صفین لڑی۔'' (ص ۱۳۱)

اس بیان کو بھی بچوں کی ذہنی سطح کے پس منظر میں پرکھا جائے تو ان کے سامنے سوالات کا ایک پہاڑ آن کھڑا ہوتا ہے۔ جواب دیا جائے تو بہت سے نازک اُمور زیر بحث آتے ہیں، جن سے کم ازکم میٹرک کے استادوں کا حکمت سے عہدہ برآ ہونا اور اس سطح کے بچوں کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، تو پھر ہم آہنگی کا وہ افلاطونی نظریہ کہاں گیا......؟

کتاب کے صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱ پر رسول کریم ﷺ کے محترم چچا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے والدِ گرامی جناب ابوطالب کا تذکرہ ہے، تاہم اس میں ان کے قبولِ اسلام نہ کرنے کا ذکر نہیں۔ احادیث میں درج ہے کہ ان کے آخری وقت میں رسولِ کریمؐ نے اصرار کر کے فرمایا کہ کلمہ پڑھ لیں مگر اُنہوں نے نہ پڑھا۔ ممکن ہے کہ کتاب کی مصنفہ نے اس لیے یہ واقعہ یا یہ

www.KitaboSunnat.com

صورتِ حال درج کرنا مناسب نہ سمجھی ہو کہ اس عمر کے بچوں کے سامنے یہ سوال کھڑا کرنا مناسب نہیں۔ خوب، مگر یہ احتیاط دیگر تاریخی روایات یا مناقشوں میں کیوں روا نہیں رکھی گئی۔

کتاب کے چھٹے حصے کے پہلے باب (ص ۱۶۳ تا ۱۷۷) میں بھی متعدد مسائل چھیڑے اور پھر نیم پخت انداز سے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اس درجے میں بچے کے سامنے حدیث اور اس کی تدوین کے معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث کی اہمیت اور سند کی صحت کے لیے جملہ احتیاطوں اور اسماء الرجال کے بے مثال پہلو کو پیش کرنے کے بجاے چلتے چلتے بہت سی چیزوں کو بے ربط انداز میں بیان کردیا گیا ہے، حالانکہ یہ تمام چیزیں سخت فنی نوعیت کی ہیں جو بہتر اور متوازن اُسلوب کا تقاضا کرتی ہیں۔ یہاں پر بالخصوص ایک اور نکتے کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ کہ صفحہ ۱۷۳ میں شیعہ تدوین حدیث کا ذکر کرکے ایک بار پھر اسلامی اور ملّی ہم آہنگی پر ضرب لگائی گئی ہے۔

ایک طرف صحیح، حَسن، ضعیف اور وضعی احادیث (ص ۱۶۵، ۱۶۶) کا مسئلہ پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ سب سے پہلے امام مالکؒ (۹۶ھ) نے، پھر امام احمدؒ بن حنبل (۱۶۴ھ) اور ان کے بعد امام بخاریؒ (۱۹۴ھ)، امام مسلمؒ (۲۰۲ھ) اور ان کے بعد ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ وغیرہ نے لاکھوں احادیث میں سے چند ہزار احادیث مرتب کیں۔ ان میں کہیں فاضل محدث کی تاریخ پیدایش، کہیں تاریخ وفات اور کہیں ایسی کچھ بھی معلومات درج نہیں ہیں۔ کیا کوئی نصابی کتاب ایسی تساہل پسندی کی متحمل ہوسکتی ہے؟ دوسرا یہ کہ لاکھوں احادیث کے استرداد کا کوئی موزوں جواز بھی بچوں کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکا۔ یہ چیز بچے کے ذہن میں شک کا کانٹا بوسکتی ہے۔ پھر جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ صفحہ ۱۷۳ پر شیعہ تدوین حدیث کا نکتہ اُٹھا کر بہت سے سوالات کی آنچ کو تیز تر کردیا گیا ہے۔ شیعہ احادیث کے تین مجموعوں یعنی اُصولِ کافی، من لا یحضرہ الفقیہ اور تہذیب الأحکام کے نام پیش کیے گئے ہیں اور ان کے مرتبین کی تاریخِ انتقال بالترتیب ۳۲۸، ۳۸۱، ۴۶۰ ہجری ہے۔ گویا کہ سُنّی احادیث اور شیعہ روایات کی تدوین کا یہ زمانی فرق بذاتِ خود ایک سوال پیدا کرتا ہے۔

خلفاے راشدینؓ کے لیے مخصوص ساتویں باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمات پر

www.KitaboSunnat.com

ایک بڑا مؤثر سبق شامل اشاعت (ص ۱۷۸تا۱۹۱) ہے، اور ان کی خلافت کے انتخاب کے موقع پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ رسولِ کریمؐ کے انتہائی بااعتماد قریبی ساتھی اور سب سے بلند مرتبہ انسان تھے، اس لیے پہلے خلیفہ کے طور پر منتخب ہوئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایک بچہ جو اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۱ پر یہ پڑھ کر آیا ہے کہ امامت و قیادت تو رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کو تفویض کردی تھی، بھلا وہ ۶۰ صفحے آگے مذکورہ بالا بیان پڑھ کر کیا سوچے گا؟ یہی نا کہ رسولؐ اللہ کی مرضی اور احکام سے بغاوت یا ایک وقت میں دو طرح کی بالکل متحارب ہدایت؟

نصاب میں ایسی شتر گربگی مستقبل کے سیاہ سفید پر قبضے کی تیاری کے لیے مصروف طالب علموں کو کیا سبق دے گی......!!

حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے معاملے (ص ۲۰۵) میں بتایا گیا ہے کہ ''حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں ووٹ دیا اور بیعت کی۔'' اس بیان پر پھر صفحہ ۱۱۱ والا سوال کیا سبق دے گا؟ آگے صفحہ ۲۱۲ پر درج ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جلیل القدر صحابہؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ بننے کی دعوت قبول کرنے کے لیے کہا، مگر حضرت علیؓ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ (اگرچہ بعد میں حضرت علیؓ نے مسلمانوں کے شدید اصرار پر یہ ذمہ داری قبول فرما لی) لیکن یہاں بھی ایک مرتبہ پھر صفحہ ۱۱۱ والی بات سامنے آتی ہے کہ اگر رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو نیابت و قیادت کا حکم دے دیا تھا تو اُنہوں نے مسلسل انکار کیوں کیا؟ اس چیز کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ رسول کریمؐ کی مرضی اور منشا کو پورا نہ کرتے، مگر طالبِ علم کے سامنے تو یہ معاملہ غور طلب ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ کے ذریعے دیے جانے والے حکم سے انکار کیا جارہا ہے۔

صفحہ ۲۱۳ پر جنگِ جمل اور صفحہ ۲۱۴ پر جنگِ صفین کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ تفصیلات مسئلے کا سیاسی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ایسے معاملات بڑے نازک اُمور کی نقاب کشائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ دونوں جانب جلیل القدر صحابہؓ ہیں، ایک جانب حضرت علیؓ ہیں اور دوسری جانب اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ جب بات تشنہ، معاملہ اَدھورا اور بحث نامکمل صورت میں ۱۴سال کے بچے کے سامنے رکھی جائے گی تو خود سوچ لیجیے کہ کون سی خلیج گہری ہوگی۔ فرقہ

www.KitaboSunnat.com

وارانہ ہم آہنگی اور تاریخ کے درست زاویۂ نظر اور منصفانہ بحث وتمحیص کے معاملات پر تو ہم اس تجزیے میں بات ہی نہیں کر رہے۔ یاد رہے کہ یہ نصاب مشرف خیالی کے اس ایجنڈے کی تائید میں پیش کیا جا رہا ہے کہ ہمیں عقیدے اور تاریخ سے کچھ غرض نہیں، ہم تو طالب علموں کو زندگی کے معاملات میں اسلام کے احکام اور قوانین سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

کتاب مجموعی طور پر آسان، عام فہم اور مؤثر اُسلوبِ بیان میں پیش کی گئی ہے، جس کے لیے مصنفہ ستائش کی مستحق ہیں، لیکن اُنہوں نے کون سی نصابی اسکیم پیش نظر رکھی، یہ معلوم نہیں ہو رہا۔ وہ طالب علم کے سامنے اسلام کی کیا تصویر اور کون سا پیغام پیش کرنا چاہتی ہیں؟ طالب علم، اُستاد اور والدین، تینوں اس سے بے خبر ہیں اور پریشان بھی؟ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بلند بانگ دعوے کو کس طرح نصابی عمل میں ڈھال رہی ہیں، اس چیز کا کوئی آغاز اور انجام موجود نہیں ہے۔ کیا نصاب تیار کرانے والوں کا ہدف یہ تو نہیں ہے کہ اسلامیات کی ایسی کتاب فرقہ واریت کو پروان چڑھانے کے جرم میں کچھ اس طرح متنازع بن جائے کہ سرے سے اسلامیات کی تدریس کو، جی سی ای یا 'او لیول'، 'اے لیول' سے خارج کرنے کا رستہ کھل جائے، اور اس کے بجائے 'آفاقی اخلاقیات' جیسا نام نہاد مضمون، بطورِ متبادل لانے کا جواز مل جائے۔ ہمارے اس خدشے کی ٹھوس بنیادیں موجود ہیں۔ دشمن ان معاملات میں 'علاج بالمثل' کا راستہ اختیار کرتا اور مقصد اپنا حاصل کرتا ہے۔ پاکستان میں جب بھی انگریزی کی عظمت کی دھاک بٹھانا مقصود ہوتی ہے تو اہل حل وعقد صوبائی زبانوں کی ترویج کا شوشا اُٹھاتے اور انھیں اُردو سے لڑانے کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور پھر خود ہی فیصلہ سنا دیتے ہیں، کہ اچھا ان میں جھگڑا ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ انگریزی کا سکّہ چلایا جائے۔

اس کتاب کے مندرجات کی پیش کاری میں بہ ظاہر شیعہ اہل علم کا کوئی حصہ نہیں ہے، لیکن وہ ان نادان ماہرین تعلیم کے ذریعے بے جا طور ایسی بحث میں اُلجھیں گے۔ اس تجزیے میں کتاب کے ان دیگر معاملات کو پیش نہیں کیا جا رہا کہ جن کا تعلق جہاد، ختمِ نبوتؐ اور دیگر اُمور سے ہے۔ کیا ہمارے حکمران اس چہیتے نظامِ تعلیم میں کسی درجے کا کوئی کردار ادا کرنے میں بے بس ہیں؟ اگر وہ بے بس ہیں تو پھر 'جی سی ای' نظام کو پاکستان کے بہترین دماغوں،

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کے مستقبل اور کوالٹی کی تعلیم حاصل کرنے والے شہریوں کی اولادوں کو افتراق، انتشار، فرقہ وارانہ بحثوں میں اُلجھانے کا اختیار کس نے دیا ہے؟ کیا یہ ریاست در ریاست نہیں ہے کہ جس پر حکومتِ پاکستان یا ریاستِ پاکستان کو کوئی قدرتِ کلام نہیں ہے اور کوئی قوتِ نافذہ تک حاصل نہیں ہے؟

صرف اسی ایک بات سے مسئلے کی نزاکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے کم و بیش ہر بڑے شہر اور ہر بڑے قصبے میں 'او/اے لیول' کے اسکول قائم ہیں اور امتحان کے نام پر ہزاروں روپے، جو آخر کار قومی سطح پر اربوں میں ڈھل کر برطانیہ عظمیٰ کی چوکھٹ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن گذشتہ پانچ برسوں کے دوران ہم نے سینٹ اور قومی اسمبلی کے فلور پر اس نظام کے تحت امتحان دینے والے بچوں کی رجسٹرڈ تعداد دریافت کرنے کے لیے سوال بھیجے اور یہ بھی پوچھا کہ رجسٹریشن اور امتحان کے لیے سال بہ سال کتنی فیس بیرونِ ملک روانہ کی جاتی ہے، مگر ان دونوں سوالوں کا جواب وزارتِ تعلیم، وزارتِ خزانہ، وزارتِ داخلہ وغیرہ کسی نے بھی نہیں دیا۔ ان سبھی وزارتوں نے ایک سطری جواب میں ٹرخا دیا: ''اعداد و شمار نہیں۔'' یا پھر یہ کہ ''یہ سوال ہم سے متعلق نہیں۔''

حیرت کی بات ہے کہ اکثر حکمرانوں کے بچے انہی اداروں میں پڑھتے ہیں، مگر وہ ان کے بارے میں معلومات مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کے برعکس مسجد مکتب کا ذکر آجائے تو داخلہ، خارجہ، اوقاف اور تعلیم کی وزارتوں کے ایوان دہل جاتے ہیں اور ایجنسیاں مل کر دس دس فہرستیں تیار کرلیتی ہیں، لیکن دوسری جانب ایک غیرملکی امتحانی نظام من مانی کرنے، من پسند فیس جمع کرنے، من بھاتے نصاب پڑھانے کے لیے آزاد، خودمختار اور طاقت کی علامت ہے، اور کالے انگریزوں کے لیے سٹیٹس سمبل ہے ـــ مگر اس کے متعلقین و متاثرین کے بارے میں ریاست کے پاس چند سطروں کی معلومات بھی موجود نہیں ہیں۔

محدث کے مضامین پر تبصرہ اور مضمون بھیجنے کے لئے مدیر محدث کے موبائل فون پر رابطہ کریں، اگر ترسیل کی کوئی شکایت درپیش ہو تو اسی موبائل پر SMS پر اکتفا کریں۔

www.KitaboSunnat.com

فقہ واجتہاد

شیخ سائد بکداش
ترجمہ: محمد مصطفیٰ راسخ

کیا والد بیٹے کا مال لے سکتا ہے؟

حدیث «أنتَ ومالك لأبيك» کا تحقیقی جائزہ

اسلام ایک مضبوط و مستحکم خاندانی نظام کا حامل دین ہے جس میں حقوق وفرائض کی لمبی چوڑی تفصیلات ملتی ہیں اور انہی پر عمل بجالا کر آج مسلمانوں میں رشتوں کا احترام اور اس کے نتیجے میں چین وسکون پایا جاتا ہے۔ موجودہ دورِ زوال میں آج بھی مسلم معاشرے اپنے اسی خاندانی نظام کی بدولت غیر مسلموں میں رشک کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اور اس امر کا کھلا اعلان ہیں کہ اسلام ہی ہماری فلاح کا ضامن ہے اور جس جس میدان میں اسلام پر عمل ہوگا، اس حد تک دین کی برکات ہمیں حاصل ہوتی رہیں گی۔ یاد رہے کہ خاندانی نظام سے لازماً 'مشترکہ خاندانی نظام' مراد نہیں بلکہ اس سے نسب ونسل، رضاعت وتربیت، کفالت، اولاد میں مساوات، وراثت و وصیت، نکاح وطلاق، نفقہ وسکنیٰ، میاں بیوی، اولاد ووالدین اور رشتہ داروں کے مابین حقوق وفرائض کے شرعی احکامات مقصود ہیں جس کا نتیجہ قریبی عزیز واَقارب میں صلہ رحمی، قربانی، ذمہ داری اور قربت ومودّت کی صورت میں نکلتا ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ مسلمانوں کے مغربی تعلیم یافتہ طبقے، سیکولرزم سے والہانہ وارفتگی کے باوجود اجتماعیت کی سب سے پہلی اور مضبوط اکائی 'خاندان' کو تاحال مذہب کی بنیاد پر ہی استوار رکھنے پر مجبور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ اجتماعی زندگی کا وہ واحد میدان ہے جہاں مذہب کو ذاتی مسئلہ سمجھنے والے اپنے بنیادی رشتوں ناطوں کو دین کی بنیاد پر ہی استوار کرنے کے سوا کوئی چارہ عافیت نہیں پاتے۔ لیکن اہل مغرب نے اس بنا پر اجتماعی میدانوں میں مذہب کی اس غیر معمولی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس کو اَحوال شخصیة Personal Life کا غیر حقیقی نام دے کر منافقت، ثنویت اور دوہرے معیار کا مظاہرہ کیا ہے۔

بہرطور اس فکری ونظری پس منظر سے قطع نظر، مسلم معاشروں میں باہمی رشتہ داریوں میں بعض مسائل انتہائی نازک وحساس حیثیت کے حامل ہیں جن میں ایک زیر نظر مسئلہ بھی ہے۔ دورِ حاضر میں اسلام کی مستند تشریح اور درپیش مسائل میں اصل مصادرِ اسلام سے رہنمائی حاصل کرنا 'محدث' کا مشن ہے۔ اسی بنا پر دو برس قبل کعبہ معظّمہ کے عین سامنے ایک جنرل سٹور پر راقم کو عربی زبان میں یہ نئی تحقیق نظر آئی تو اُسی وقت یہ عزم کرلیا کہ اس کو اُردو میں بھی پیش کیا جائے گا۔ آج یہ خواہش عملی طور پر الحمدللہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ موضوع

www.KitaboSunnat.com

کے انتہائی نازک اور کثیر الجہت ہونے کے باوجود فاضل محقق نے بڑے سلجھے اور واضح علمی اُسلوب میں پیش نظر مسئلہ کی تحقیق سے پورا اِنصاف کیا ہے۔ مجلس التحقیق الاسلامی کے ریسرچ سکالر قاری مصطفیٰ راسخ کے اُردو ترجمہ میں بھی بڑی سلاست اور روانی موجود ہے۔ اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط میں ان آراء پر تجزیہ و تبصرہ کے بعد محدث کے قارئین ایک واضح موقف تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ ان شاء اللہ (حسن مدنی)

حمد وثنا کے بعد..... ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا * وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا * رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل:۲۳ تا ۲۵)

''تیرے ربّ نے فیصلہ کردیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہاری موجودگی میں ان میں سے کوئی ایک، یا دونوں، کبرسنی کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ اُنہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان کے ساتھ احترام سے بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو۔ اور دعا کیا کرو کہ ''پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح اُنہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا ربّ خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لئے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہوکر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔''

◉ سیدنا ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ''ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا: رسولِ کریمؐ! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا: تیری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تیرا باپ۔'' (صحیح بخاری:۵۹۷۱)

◉ سیدنا ابو درداءؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''والد جنت کے دروازوں میں سے درمیان والا دروازہ ہے، اگر تو چاہے تو اس دروازے کو ضائع کردے اور اگر چاہے تو اسے محفوظ کرلے۔'' (جامع ترمذی:۱۹۰۰)

www.KitaboSunnat.com

◉ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ربّ کی رضا والد کی رضا میں ہے، اور ربّ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں۔'' (جامع ترمذی:۱۸۹۹)

اسی معنی کی متعدد آیاتِ کریمہ اور احادیثِ مبارکہ موجود ہیں، جن میں والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

برّ الوالدین ''والدین کے ساتھ نیکی کرنا'' ایک جامع کلمہ ہے جو ہر قسم کی خیر اور پسندیدہ فعل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کی زیارت کرنا، ان کا احترام کرنا، ان کے ساتھ ادب سے پیش آنا، ان کے لئے اپنا مال خرچ کرنا، ان کے حقوق کا خیال رکھنا، ان کے پسندیدہ امور کو بجالانا اور ان کی ناپسندیدگی سے بچنا، نافرمانی نہ کرنا اور ان کو اپنے کسی قول وفعل سے اذیت نہ دینا۔ وغیرہ (تعریف 'برالوالدین' دیکھئے: مشارق الأنوار للقاضي:۱/۸۴،۲/۱۰۰؛ فتح الباري:۱۰/۴۰۶؛ تحریر ألفاظ التنبیه للنووي،ص۱۴۹)

'بر الوالدین' کا راستہ جنت کو لے جانے والا بہترین راستہ ہے اور دنیا و آخرت کی سعادت کا دروازہ ہے۔ والدین کے حقوق میں سے سب سے بڑا حق بڑھاپے میں ان پر خرچ کرنا ہے، بیٹا خواہ مال دار ہو یا تنگ دست، اگرچہ والدین کا مذہب مختلف ہی کیوں نہ ہو۔☆

یہ بھی یاد رہے کہ والدین کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے، خواہ والدین دائمی مریض ہوں جو کمائی کرنے سے عاجز ہوں یا صحت مند ہوں اور کمائی کرسکتے ہوں۔ برخلاف شوافع کے جن کے نزدیک طاقت مند اور کمانے کی قدرت رکھنے والے باپ پر خرچ کرنا بیٹے کے لئے ضروری نہیں۔

جب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ والدین کا نفقہ بیٹے پر واجب ہے تو اس مسئلہ میں اصل حکم یہ ہے کہ یہ نفقہ معروف طریقے سے واجب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ البتہ نیکی اور احسان یہی ہے کہ والدین پر اچھے طریقے سے خرچ کیا جائے اور آدمی جو چیز اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے پسند کرتا ہے، وہی چیز بلکہ اس سے بہتر اپنے والدین کے لئے پسند کرے۔ یہ رویہ مناسب ومعروف طریقہ نہیں کہلا سکتا کہ

☆ اس مسئلہ پر مذاہب اربعہ کا موقف جاننے کے لئے دیکھیں: شرح السنة للبغوي: ۹/ ۳۲۹، شرح أدب القاضي للخصاف، للصدر الشهید ٤/ ۳۱۷ ـ ۳۳۳، المبسوط للسرخسي ٥/ ۲۲۲، تبیین الحقائق ۳/ ٦٤، بدائع الصنائع ٤/ ۳۰ وغیره

www.KitaboSunnat.com

آدمی خود تو عیش وعشرت کی زندگی گزار رہا ہو جبکہ اس کے والدین تنگ دستی اور فقر وفاقے کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔

والدین پر خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ بیٹے پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ والدین پر خرچ کرنے کے عمل کو احسان نہ سمجھے بلکہ یہ اس پر قرض ہے جو اس کے والدین نے اس پر خرچ کیا تھا اور ان بے شمار احسانات کا بدلہ ہے جو والدین نے بچپن میں اس پر کئے تھے، جیسا کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں واضح طور پر بیان ہوا ہے اور بیٹے کو ہر دم یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے والدین کی من جملہ نیکیوں میں سے ایک نیکی وہ خود ہے اور والدین ہی اس کے حصول اور دنیا میں آنے کا ظاہری سبب ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں متعدد لوگوں کے ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوا کہ کیا باپ جب چاہے، زبردستی اپنے بیٹے کا مال لے سکتا ہے؟ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے: «أنت و مالك لأبيك» ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے۔'' اور کیا مطلقاً باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مال پر قبضہ کرلے، خواہ باپ غنی ہو یا فقیر، محتاج ہو یا غیر محتاج، اور بیٹا چھوٹا ہو یا بڑا، وہ یہ مال لینے سے راضی ہو یا ناراض اور والد کا اپنے بیٹے کا مال حاصل کرنا بیٹے کے علم میں ہو یا نہیں؟

علاوہ ازیں جب باپ محتاج ہو تو کیا وہ اپنی ضرورت کے مطابق ہی لے سکتا ہے یا جتنا اس کی مرضی چاہے، وہ لے لے؟ اور کیا ماں اور دادا کو بھی باپ کی مانند یہ حق حاصل ہے یا یہ اختیار صرف باپ کو ہی حاصل ہے؟

میرے پاس اس قسم کے متعدد سوالات آئے جنہوں نے مجھے اس مختلف فیہ مسئلہ پر ایک تحقیقی بحث لکھنے پر مجبور کردیا، لہٰذا میں نے اس مسئلہ میں اہل علم وفقہا کے اَقوال وآرا کو دلائل، اعتراضات وجوابات اور تبصرہ وتجزیہ کے ساتھ قلم بند کردیا ہے۔ یہ بحث تین حصوں اور ثمرہ ونتیجہ میں ترتیب شدہ ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے صحیح اور درست طریقے پر دین حنیف کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، مجھے اِخلاص کی نعمت سے نوازے اور مجھ سمیت ہم سب کو 'ہمارے والدین'، ہمارے اساتذہ، ہمارے اہل وعیال اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو اجرِعظیم سے نوازے۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم اجمعین

www.KitaboSunnat.com

حصہ اوّل: فقہاء کرام کے اقوال اور ان کے دلائل

اس مسئلہ میں فقہاے کرام اور اہل علم کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول

باپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ضروری نفقہ کے سوا اپنے بیٹے کے مال میں سے کچھ حصہ لے، اور وہ اس وقت جب وہ اس کا ضرورت مند ہو۔ بیٹے کا مال اُسی کی اپنی ملکیت ہے اور باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ اس کے مال میں سے کچھ لے، تاہم بیٹا اپنی رضامندی سے دے دیتا ہے تو مضائقہ نہیں ہے۔

قائلین: یہ قول جمہور اہل علم اور حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ میں سے اکثر فقہاے کرام کا ہے۔ امام احمدؒ سے بھی اس قول کی ایک روایت منقول ہے جبکہ حنابلہ میں سے ابوالوفاء ابن عقیلؒ کا بھی یہی قول ہے۔

صحابہ وتابعین میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہی قول ہے اور کبار فقہاے تابعین، شریح القاضی، جابر بن زید، محمد بن سیرین، حماد بن ابی سلیمان اور زہری رحمہم اللہ کا بھی یہ قول ہے جبکہ ابراہیم نخعیؒ اور مجاہدؒ سے ایک ایک روایت مروی ہے۔

اس قول کے قرآن، سنت، اجماع، اور عقل وفہم سے دلائل بالترتیب حسبِ ذیل ہیں:

❶ قرآن مجید سے دلائل:

① اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ﴾ (البقرۃ: ۲۱۵)

''لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔''

امام قرطبیؒ اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

www.KitaboSunnat.com

''غنی شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج والدین کے کھانے اور پہننے اوڑھنے وغیرہ پر اتنا خرچ کرے جتنا اپنے اوپر خرچ کرتا ہے۔'' (تفسیر قرطبی:۳/۱۷)

مذکورہ آیتِ کریمہ مال پر بیٹے کی ملکیت کو ثابت کرتی ہے اور والدین کو اللہ تعالیٰ نے مصارفِ انفاق میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کے مال کو اپنی ملکیت بنا لے۔ اگر بیٹے کا مال باپ کا ہی ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس آیت میں والدین کو مصارفِ انفاق میں ذکر نہ کرتے اور اگر بیٹا اپنے کمائے ہوئے مال کا مالک نہ ہوتا تو اس پر اپنے والدین کا نفقہ ثابت نہ ہوتا جبکہ پیچھے فقہاے کرام کا اتفاق گذر چکا ہے کہ ضرورت مند والدین کا نفقہ بیٹے کے ذمہ واجب ہے۔ (المُحلّٰی:۸/۱۰۷؛ مشکل الآثار للطحاوي ۴/۲۷۷)

② اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ * اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ * فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ (المعارج:۲۹،۳۱)

''جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں کے جن سے محفوظ نہ رکھنے میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔''

امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیتِ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لونڈی کا مالک اپنی لونڈی کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے جبکہ غیر مالک پر لونڈی کے ساتھ مباشرت کرنا حرام ہے اور اس آیتِ کریمہ کے حکم میں دونوں طرح کے بیٹے آجاتے ہیں: ایک وہ بیٹا ہے جس کا والد زندہ ہو اور دوسرا وہ بیٹا جس کا والد زندہ نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ بیٹے کا مال بیٹے کا اپنا ذاتی ہے، والدین کا نہیں ہے۔ اگر بیٹے کا مال باپ کی ملکیت ہوتا تو جس بیٹے کا والد زندہ ہے اس کے لئے اپنی لونڈی کے ساتھ مباشرت کرنا حرام ہوتا، کیونکہ حقیقتاً وہ لونڈی اس کے باپ کی ملکیت ہوتی جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی لونڈی کے ساتھ مباشرت کی اجازت بیٹے کی ملکیت کو ثابت کرتی ہے۔ (المُحلّٰی:۸/۱۰۷؛ مُشکل الآثار للطحاوي:۴/۲۷۷)

③ اللہ تعالیٰ آیتِ وراثت میں فرماتے ہیں:

www.KitaboSunnat.com

﴿وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ﴾ (النساء:۱۱)

''اگر میت صاحبِ اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہئے اور اگر وہ صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اسکے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے گا۔''

✳ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

''جب اللہ تعالیٰ نے باپ کو بیٹے کی میراث میں سے دیگر ورثا کی مانند ایک مقرر حصہ دیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹا بلا شرکت غیرے اپنے مال کا خود مالک ہے۔'' (الرسالہ: ص ۴۶۸)

✳ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ

''اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی موت پر ماں کو مقرر حصہ دیا ہے، اور یہ امر محال ہے کہ بیٹے کی موت پر ماں کو بیٹے کی بجائے باپ کے مال میں سے مقرر حصہ دیا جائے۔'' (مشکل الآثار: ۴/۲۷۷)

✳ اس آیتِ کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹے کی موت پر باپ کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، اور اگر باپ ہی اپنے بیٹے کے کل مال کا مالک ہوتا تو اس کو چھٹا حصہ ملنے کی بجائے سارا مال ملنا چاہئے تھا۔ (سنن بیہقی: ۷/۴۸۱؛ فتح القدیر از امام ابن ہمامؒ: ۴/۲۲۳)

✳ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میت کے مال میں والدین، خاوند، بیوی، بیٹے اور بیٹیوں سمیت تمام ورثا کے حصے مقرر کردیئے ہیں۔ اگر بیٹے کا مال والد کی ملکیت ہوتا تو مذکورہ تمام ورثا محروم ہوجاتے، کیونکہ وہ ایک زندہ انسان (والد) کا مال ہوتا۔ (المُحلّٰی: ۸/۱۰۶؛ الکاشف عن حقائق السنن شرح مشکوٰۃ المصابیح از امام طیبیؒ: ۶/۱۹)

④ اللہ تعالیٰ آیتِ وراثت میں فرماتے ہیں:

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ﴾ (النساء:۱۱)

''(یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جبکہ میت کی وصیت کو پورا کردیا جائے اور اس کے ذمے قرض کو ادا کردیا جائے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ اس امر کی وضاحت کررہے ہیں کہ میت کے ترکہ کی تقسیم، اس کی وصیت کو پورا کرنے اور اس پر قرض کو ادا کرنے کے بعد کی جائی گی۔ یہ محال امر ہے کہ باپ کے مال سے بیٹے (میت) کی وصیت کو پورا کیا جائے اور اس بنا پر اس کے قرض کو ادا

www.KitaboSunnat.com

کیا جائے۔ (مشکل الآثار:۴/۲۷۷)

⑤ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (البقرۃ:۱۸۸)

''اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (النساء:۲۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ۔''

مذکورہ دونوں آیتیں اور اس معنی کی دیگر آیاتِ کریمہ جو کسی دوسرے کا مال باطل طریقے سے کھانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں، ان کا مدلول ومفہوم عام ہے جس میں عام انسانوں کے ساتھ باپ بھی شامل ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ پر اپنے بیٹے کا مال کھانا اور اسے اپنی ملکیت بنالینا حرام ہے الا یہ کہ بیٹا از خود رضا مندی سے دے دے۔ (سنن بیہقی:۷/۴۸۱)

تنبیہ: یاد رہے کہ یہ عموم، اجماعِ امت کے ساتھ خاص ہو چکا ہے کہ والد فقط اپنی ضرورت کے مطابق اپنے بیٹے کے مال میں سے لے سکتا ہے، خواہ بیٹا راضی نہ بھی ہو۔ اس لئے اس عموم سے استدلال کرتے ہوئے باپ کے لئے بہ قدر ضرورت بیٹے کے مال سے لینا حرام نہیں۔

❷ سنتِ نبویؐ سے دلائل

① سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إن دماء كم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا، في بلدكم هذا، في شهركم هذا» (صحیح بخاری:۱۷۳۹، صحیح مسلم:۲۱۵۹)

''بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو، تمہارے اس دن اور اس شہر اور اس مہینے کی حرمت کی طرح، تمہارے درمیان حرام ہیں۔''

امام طحاویؒ اس حدیث کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مؤمنوں کے اَموال کو ایسے ہی حرام قرار دیا ہے جس طرح ان کے خونوں کو حرام کیا گیا ہے، اور اس حرمت میں سے والد سمیت کسی کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ (شرح معانی الآثار:۴/۱۵۹)

نبی کریم ﷺ نے حرمتِ اَموال کو حرمتِ اَبدان کی مانند قرار دیا ہے۔ جس طرح باپ کے

www.KitaboSunnat.com

لئے، سوائے حقوقِ واجبہ کے، اپنے بیٹوں کے اَبدان حرام ہیں، اسی طرح اَموال بھی حرام ہیں سوائے حقوقِ واجبہ کے، اور حقوقِ واجبہ سے مراد اس کی نفقہ کی ضروریات ہیں۔

② نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه»

(مسند احمد: ۷۲/۵، سنن دارقطنی: ۲۶/۳، سنن بیہقی: ۱۰۰/۶)

''کسی مسلمان آدمی کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں ہے۔''

اس حدیث کا عموم بھی اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ باپ پر اپنے بیٹے کے مال کو استعمال کرنا حرام ہے، کیونکہ اس حدیث میں والد سمیت کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔

③ امام بیہقی اپنے استدلال کے لیے ایک مرسل روایت بھی لائے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«كل أحد أحق بماله من والده وولده والناس أجمعين»

(السنن الکبریٰ از امام بیہقی: ۴۸۱/۷، سنن دارقطنی: ۲۳۶/۴)

''ہر شخص اپنے مال کا، اپنے والد، اپنے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ حقدار ہے۔''

یہ حدیث اپنے مدلول پر واضح اور نص صریح ہے۔

④ سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو کہا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں یوم الاضحیٰ کو اس اُمت کے لئے عید کا دن بنا دوں۔ اس آدمی نے کہا: آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر میں اپنے بیٹے کے مَنِیحة (ایسا بالغ جانور ہے جو دودھ دوہنے کے لئے کسی کو مخصوص مدت کے بعد واپس کرنے کی شرط پر دیا گیا ہو) کے علاوہ کوئی جانور نہ حاصل کرسکوں تو کیا اس کو قربان کردوں، آپؐ نے فرمایا: نہیں (وہ جانور مت قربان کر) لیکن تو اپنے بالوں، ناخنوں اور مونچھوں کو کاٹ لے اور اپنے زیرناف بالوں کو مونڈ لے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی تیری مکمل قربانی ہے۔'' (سنن نسائی: ۴۳۶۵، سنن ابوداؤد: ۲۷۸۹، مسند احمد: ۱۶۹/۲، مستدرک حاکم: ۲۲۳/۴، وقال صحیح الاسناد ولم یخرجاہ ووافقہ الذہبی)

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو اپنے بیٹے کا مَنیحة ذبح کرنے سے منع کردیا اور اس کو اپنے ذاتی مال سے قربانی کرنے کا حکم دیا اور اس کی ترغیب دی تو اس

www.KitaboSunnat.com

سے ثابت ہوا کہ بیٹے کے مال کا حکم باپ کے مال کے حکم سے مختلف ہے۔

(شرح معانی الآثار:۱۵۹/۴)

۳ اجماعِ اُمت

امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ نصوص اور اجماع سے یہ صحیح ثابت ہو چکا ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس غلام اور باندی ہو اور ان دونوں کا والد بھی زندہ ہو تو وہ غلام اور لونڈی اپنے مالک کی ملکیت ہیں، اپنے باپ کی نہیں۔ (المُحلّٰی:۱۰۷/۸)

۴ متفق علیہ اُصول

تمام اہل علم کے نزدیک متفق علیہ اُصول ہے کہ ہر انسان کے مال کی حفاظت کی جائے اور کسی دوسرے شخص کو اس کے مال میں شریک نہ کیا جائے اور اس کے مال پر کسی غیر کی ملکیت دلیل قطعی کے بغیر ثابت نہ ہوگی اور ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر ہم بیٹے کے مال کو باپ کی ملکیت قرار دے دیں۔

۵ عقلی دلائل

اس قول کی تائید میں عقلی دلائل سے بھی استدلال کیا گیا ہے جن میں سے ایک قول امام سرخسیؒ کا ہے، فرماتے ہیں: بیٹے کے مال میں باپ کی ملکیت نہیں ہے، کیونکہ کمائی، کمانے والے کے کام کرنے کے نتیجے میں اس کی ملکیت بنتی ہے۔ جس طرح باپ اپنے بیٹے کا مالک نہیں ہے، اسی طرح بیٹے کی کمائی کا بھی مالک نہیں ہے۔ کیونکہ بیٹا ہی اپنی کمائی کا حقیقی مالک ہے۔ حتیٰ کہ اپنے مال میں تصرف کا اختیار صرف بیٹے کو حاصل ہے کہ وہ اپنی لونڈی سے مباشرت کرے یا اپنا غلام آزاد کردے۔ بچپن میں والد نگران ہونے کی حیثیت سے بیٹے کے مال میں تصرف کرتا رہتا ہے مگر بیٹے کی بلوغت کے بعد یہ سبب زائل ہوجاتا ہے، اب وہ خود اپنے مال میں تصرف کا زیادہ حقدار ہے۔

اگر بیٹے کا مال باپ کی ملکیت ہے، تو باپ جب اپنے بیٹے کو ہبہ وغیرہ کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ خود اپنی ذات کو ہی ہبہ کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ فضول بات ہے جس کا اہل علم میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیٹے کا مال اسی کی ملکیت ہے،

www.KitaboSunnat.com

باپ کی ملکیت نہیں۔

دوسرا قول

باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے مال میں سے جب چاہے جتنا چاہے لے لے اور اپنی ملکیت بنا لے، خواہ باپ کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بیٹا چھوٹا ہو یا بڑا، بیٹی ہو یا بیٹا، وہ مال دینے پر خوش ہو یا ناخوش، بیٹے کو باپ کے مال لینے کا علم ہو یا نہ ہو۔

قائلین: یہ قول صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے مروی ہے جن میں عمر بن خطابؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، جابر بن عبداللہؓ، انس بن مالکؓ، ابن عباسؓ اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ شامل ہیں۔

فقہاے تابعین مشروق بن اَجدعؒ، سعید بن میبّب، ایک قول میں ابراہیم نخعیؒ، عامر شعبیؒ، ایک قول میں مجاہدؒ، حسن بصریؒ، حکم بن عتیبہؒ اور قتادہ بن دعامہ سدوسی سے بھی یہی موقف مروی ہے۔ فقہاے تبع تابعین میں سے ابن ابی لیلیٰ اور محمد بن عبدالرحمٰن کا بھی یہی قول ہے اور متاخرین میں سے امام صنعانیؒ نے حدیث «أنت و مالك لأبيك» سے استدلال کرتے ہوئے اسی قول کی تائید کی ہے۔

دلائل: اس قول کے قائلین کی دلیل درج ذیل احادیث وآثار ہیں:

① امام ابن حزمؒ اپنی سند کے ساتھ سیدنا عمر بن خطابؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک باپ بیٹا آئے، بیٹا اپنے باپ سے ایک ہزار درہم کا مطالبہ کر رہا تھا جو اس نے اپنے باپ کو بطورِ قرض دیے ہوئے تھے جبکہ باپ کہہ رہا تھا کہ وہ قرض واپس کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ سیدنا عمرؓ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور باپ کے ہاتھ میں دے دیا اور فرمایا: ''یہ بیٹا اور اس کا مال اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے عطیہ ہے۔''

(المُحلّٰی: ۱۰۴/۸، مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۵۷/۷، ۱۵۸)

② امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ سیدنا علی بن ابی طالبؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ اُنہوں نے بیٹے کا مال والد کو دینے کا فیصلہ دیا۔

(المُحلّٰی: ۱۰۴/۸، ومصنف ابن ابی شیبہ: ۱۵۸/۷، ۱۵۹)

www.KitaboSunnat.com

③ امام ابن حزمؒ نے اپنی سند کے ساتھ جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت کیا ہے اور اسی روایت کو صحیح کہا ہے کہ ''ماں باپ اپنے بیٹے کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر لے سکتے ہیں۔'' (المحلّٰی:۱۰۴/۸)

④ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے بھی سیدنا جابرؓ کی مانند صحیح ثابت ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: آدمی اپنے بیٹے کے مال سے جتنا چاہے کھا سکتا ہے، لیکن بیٹا اپنے باپ کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر نہیں کھا سکتا۔ (ایضاً)

⑤ امام ابن حزمؒ ہی اپنی سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ فضالہ بن ہرمز حنفیؒ نے سیدنا انسؓ بن مالک کو کہا: میرے باپ نے میری لونڈی پر قبضہ کرلیا ہے حالانکہ میرے باپ نے اس کو خریدا نہیں؟ سیدنا انس بن مالکؓ نے فرمایا: یہ لونڈی تیرے باپ کی ہے، اور تیرا مال اس کی کمائی ہے، تو اور تیرا مال اس کے لئے حلال ہے، اور اس کا مال تیرے اوپر حرام ہے، اِلا یہ کہ وہ تجھے رضا مندی سے دے دے۔ (ایضاً)

⑥ امام ابن حزمؒ اپنی سند کے ساتھ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: «أولادكم هبة الله لكم، وأموالهم لكم» ''تمہاری اولادیں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں اور ان کے مال تمہارے لئے ہیں۔'' (ایضاً)

اس موقف کے قرآن کریم اور سنت مطہرہ سے دیگر تفصیلی دلائل حسبِ ذیل ہیں:

❶ قرآنِ مجید سے دلائل

① اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ أَنْ تَأْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ اٰبَائِكُمْ أَوْ بُيُوْتِ أُمَّهٰتِكُمْ... ﴾ (النور:۶۱)

''کوئی حرج نہیں اگر کوئی اندھا، یا لنگڑا، یا مریض (کسی کے گھر سے کھالے) اور نہ تمہارے اوپر اس میں کوئی مضائقہ ہے کہ اپنے گھروں سے کھاؤ یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے۔''

اس آیتِ کریمہ میں وجہ دلالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دس قسم کے رشتہ دار بیان کئے ہیں جن کے گھروں سے کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ان دس اصناف میں اولاد کا

www.KitaboSunnat.com

کوئی تذکرہ نہیں ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں ﴿أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ﴾ کے الفاظ نہیں ہیں، کیونکہ اولاد ﴿مِنْ بُيُوتِكُمْ﴾ کے حکم میں ہی داخل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے گھر والدین کے اپنے گھروں کی مانند ہیں، اسی لئے اولاد کے گھروں کا الگ سے ذکر نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اولاد کے گھر بھی اولاد کے ہیں بلکہ والدین کے ہی گھر ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ حدیثِ نبوی «أنت ومالك لأبيك» درحقیقت کتاب اللہ سے ہی ماخوذ اور اس آیت کے ضمن میں موجود مخفی نتائج ومضمرات کی تفصیل ہے۔ (المغنی لابن قدامہ:۶/۲۸۸ بروایتِ سفیان بن عیینہ، مجموع الفتاویٰ:۳۴/۶۸ کشاف القناع:۴/۳۱۷)

④ امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا اپنے باپ کے لئے عطیہ (ہبہ) بنایا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ﴾ (الانبیاء:۷۲) ''اور ہم نے اسے اسحٰق عطا کیا اور یعقوب''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ﴾ (الانبیاء:۹۰)

''اور ہم نے اسے یحییٰ عطا کیا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا﴾ (مریم:۵)

''تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کردے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحٰقَ﴾ (ابراہیم:۳۹)

''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسحٰق اور اسماعیل جیسے بیٹے دیئے۔''

اور جو شے (یعنی اولاد) باپ کو ہبہ کی گئی ہے اس میں باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے غلام کی مانند اس اولاد کا مال بھی لے سکتا ہے۔ (المغنی:۶/۲۸۸؛ کشاف القناع:۴/۳۱۷)

❷ حدیثِ نبویؐ سے دلائل

① اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ، اس کو دیے گئے قرض کے سلسلے میں جھگڑا کررہا تھا، آپؐ نے فرمایا:

www.KitaboSunnat.com

«أنت ومالك لأبيك» ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے۔'' (صحیح ابن حبان: ۱۴۲/۲ وصحَّحه الإمام العيني في عمدة القاري: ۱۴۲/۱۳)

② سیدنا عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور وہ اپنے باپ کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔ اس آدمی نے کہا: یارسول اللہ ﷺ یہ (میرا باپ) میرے مال کا ضرورت مند ہے؟ آپؐ نے فرمایا: «أنت ومالك لأبيك»

''تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے۔'' (مسند احمد: ۲۰۴/۲)

③ سیدنا عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرے پاس مال، اور باپ ہے اور میرا باپ میرے مال کا صفایا کرنا چاہتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: «أنت ومالك لأبيك» ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے۔'' مزید فرمایا کہ تمہاری اولادیں تمہاری بہترین کمائی ہیں، پس تم اپنی اولادوں کی کمائی سے کھاؤ۔'' (مسند احمد: ۲۱۵/۲)

④ سیدنا عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میرا والد میرے مال کا صفایا کرنا چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا: تو اور تیرا مال تیرے والد کے لئے ہے۔ بے شک بہترین کھانا، تمہاری اپنی کمائی سے ہے اور تمہاری اولادوں کے اَموال بھی تمہاری ہی کمائی ہے، پس تم خوش دلی کے ساتھ کھاؤ۔'' (احمد: ۱۷۹/۲)

⑤ سیدنا عمارہ بن عمیرؓ سے مروی ہے، وہ اپنی پھوپھی سے روایت کرتے ہیں کہ ''اُنہوں نے اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے سوال پوچھا کہ میری گود میں یتیم بچہ ہے، کیا میں اس کا مال کھا سکتی ہوں؟ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہؓ نے فرمایا: بے شک بہترین کھانا، انسان کی اپنی کمائی سے ہے اور اولاد بھی اس کی کمائی ہے۔'' (سنن ابوداود: ۳۵۲۸، سنن نسائی: ۴۴۵۰)

⑥ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہؓ سے مروی ہے کہ اُنہوں نے فرمایا: ''آدمی کا بیٹا اس کی کمائی ہے بلکہ بہترین کمائی ہے، لہٰذا تم اپنے اَموال سے کھاؤ۔'' (سنن ابوداؤد: ۸۰۰/۳، رقم ۳۵۲۹)

مذکورہ احادیث کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اور اولاد کی جملہ ملکیت کو باپ کی کمائی قرار دیا، بلکہ بہترین کمائی قرار دیا ہے، کیونکہ باپ کی ذات ہی،

www.KitaboSunnat.com

بیٹے کے وجود اور اس کی جملہ کمائی کا سبب ہے اور والدین کے لئے مطلقاً جائز ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے جس طرح چاہیں، فائدہ اُٹھائیں۔

⑦ سیدنا معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں کہ جس کو کرنے سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، اگرچہ تجھے عذاب دیا جائے اور والدین کی اطاعت کرنا، اگرچہ وہ تجھے تیرے مال اور تیری ملکیت میں موجود ہر چیز سے نکال دیں.....

(قال المنذري في الترغيب والترهيب :١/ ٣٨٣، رواه الطبراني في الأوسط ٢٩٥٦ ولا بأس بإسناده في المتابعات)

⑧ سیدنا ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے سات چیزوں کی وصیت فرمائی: اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، اگر تجھے ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے یا جلا دیا جائے.....اپنے والدین کی اطاعت کرنا، اگرچہ وہ تجھے اپنی دنیا سے نکل جانے کا حکم دیں، پس تو نکل جا۔

(الأدب المفرد للبخاري :١/ ٦٩، وقال الهيثمي في مجمع الزوائد:٤/ ٢١٧ رواه الطبراني وفيه شهر بن حوشب وحديثه حسن وبقيه رجاله ثقات)

آخر الذکر دونوں احادیث میں نبی کریم ﷺ نے والدین کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنی اولاد کو اپنے مال اور اپنی ملکیت میں موجود دنیا کی ہر چیز سے نکل جانے کا حکم ہی کیوں نہ دیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد کے مال میں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے اور بیٹے پر واجب ہے کہ اپنے مال کے بارے میں والدین کے حکم کو مانے اور ان کی اطاعت کرے۔

تیسرا قول

یہ قول بھی دوسرے قول کی مانند ہے کہ باپ اپنے بیٹے کے مال پر قبضہ کرسکتا ہے، لیکن اُنہوں نے چند شرائط لگا دی ہیں، جن کی موجودگی میں باپ اپنے بیٹے کا مال لے سکتا ہے۔

قائلین: یہ حنابلہ کا قول ہے اور ان کے ہاں اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

(المغنی:۶/۲۸۸، کشاف القناع للبہوتی:۴/۳۱۷)

www.KitaboSunnat.com

شرط ①: وہ مال بیٹے کی ضرورت سے زائد ہو تاکہ اس مال کو اپنی ملکیت میں لینے سے بیٹے کو ضرر نہ پہنچے، کیونکہ ضرر سے منع کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لا ضَرَر ولا ضِرار» (ابن ماجہ:۲۳۴۰، مستدرک حاکم:۲/۵۷ وصحّحه ووافقه الذهبي على تصحيحه)

لہٰذا باپ اپنے بیٹے کے ایسے مال کو اپنی ملکیت میں نہیں لے سکتا جو اس کی ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہو جیسے کوئی مشینری جس سے وہ روزی کماتا ہے، یا تجارت میں رأس المال وغیرہ۔ کیونکہ شریعت کی نظر میں انسان کی ضرورت اس کے قرض پر مقدم ہے۔ جو باپ پر بھی بالاولیٰ مقدم ہے۔

چنانچہ فقہاء تابعین میں سے عطاء بن ابی رباح مکیؒ سے منقول ہے کہ باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے مال کو اپنی ملکیت میں لے سکتا ہے بشرطیکہ بیٹے کو اس سے ضرر نہ ہو۔

شرط ②: باپ وہ مال اپنے لئے حاصل کرے، نہ کہ دوسرے بیٹے کو دے دے، یعنی ایک بیٹے (زید) کا مال لے کر دوسرے بیٹے (عمرو) کو نہ دے، کیونکہ یہ منع ہے اور نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو اپنے مال میں سے عطیہ دے دے جبکہ دیگر کو نہ دے۔ (صحیح بخاری:۲۶۵۰) جب باپ اپنے ذاتی مال سے اپنی اولاد میں سے عطیہ دینے کے لئے کسی کو خاص نہیں کرسکتا تو ایک بیٹے کے مال سے لے کر دوسرے کو دینے کے لئے خاص کرنا بالاولیٰ حرام ہے۔

شرط ③: بیٹے کے مال کو اس وقت اپنی ملکیت بنانا جب کہ بیٹا یا باپ مرض الموت کی حالت میں نہ ہوں، کیونکہ مرض کے ساتھ ہی ملکیت بنانے کا اختیار منقطع ہوگیا۔

شرط ④: باپ کافر اور بیٹا مسلمان ہو تو اس وقت بھی باپ اپنے بیٹے کے مال سے کچھ نہیں لے سکتا، بالخصوص اس وقت جب بیٹا کافر ہونے کے بعد مسلمان ہوجائے اور اس کا باپ کفر پر ہی قائم ہو۔ (الاختیارات الفقہیہ: ص۱۸۷)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''اسی کے مشابہ صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باپ مسلمان ہو اور بیٹا کافر ہو۔ اس صورت میں بھی باپ اپنے بیٹے کے مال سے کچھ نہیں لے سکتا کیونکہ اختلافِ ادیان سے ولایت اور وراثت منقطع ہوجاتی ہے۔''

www.KitaboSunnat.com

شرط ⑤: باپ جس چیز کو اپنی ملکیت میں لے رہا ہے وہ چیز بعینہٖ موجود ہو کیونکہ باپ اپنے بیٹے کے قرض کا مالک نہیں بن سکتا اور باپ کسی بھی چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے اس میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتا، جیسا کہ احادیث میں کسی شے کو قبضہ میں لینے سے قبل اس میں تصرف کرنے سے صریح ممانعت وارد ہوئی ہے۔

جہاں تک باپ کی ملکیت کے ثبوت کا تعلق ہے تو یہ ملکیت اس کی نیت یا قول سے ثابت ہوجائے گی۔ مثلاً باپ کسی چیز کو اُٹھا لے اور دل میں نیت کرے کہ اب یہ میری ملکیت ہے یا زبان سے کہے کہ میں فلاں چیز کا مالک ہوں۔

شرط ⑥: قول یا نیت سے قبضہ کر لینے سے پہلے بیٹے کے مال میں باپ کا تصرف غیر صحیح ہے، اگرچہ غلام ہی آزاد کرنا ہو۔ کیونکہ بیٹے کی اپنے مال پر مکمل ملکیت ہے اور وہ اپنے مال میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اپنی لونڈی کے ساتھ مباشرت کرسکتا ہے۔ اگر لونڈی کی ملکیت باپ اور بیٹے میں مشترک ہو تو وہ ایسی لونڈی کے ساتھ بالکل اسی طرح مباشرت نہیں کرسکتا جیسا کہ کسی اور شخص کے ساتھ مشترکہ لونڈی سے وہ مباشرت نہیں کرسکتا۔ الغرض باپ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس شے کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے، اسے پہلے اپنے قبضہ میں لے پھر اس میں تصرف کرے۔ بنا بریں باپ اپنے بیٹے کے قرض یا جرمانے کا مالک نہیں بن سکتا، کیونکہ وہ ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا۔

مذکورہ شرائط کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پہلی شرط ہی اہم ترین شرط ہے جبکہ بقیہ پانچ شرائط کا ہر حال اور جملہ معاملات میں لحاظ کرنا ضروری ہے، اور یہ شرائط ہمارے اسی مسئلہ کے ساتھ خاص نہیں ہیں۔

دلائل

تیسرے قول کے دلائل، درحقیقت دوسرے قول والے دلائل ہی ہیں جو سابقہ صفحات میں گذر چکے ہیں۔ ایسے ہی شروط و قیود کے دلائل بھی شرائط کے ساتھ ہی ذکر کئے جا چکے ہیں۔

اگلی قسط میں فقہاے کرام کے تینوں اقوال اور ان کے دلائل کا تجزیہ وتبصرہ پیش کیا جائے گا، اور ان میں پیش کردہ استدلال کا باہم تقابل کرتے ہوئے ایک واضح موقف تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

www.KitaboSunnat.com

فقہ واجتہاد

حافظ حسن مدنی

سزائے موت؛ شریعتِ اسلامیہ کی نظر

اس سے پہلے ادارتی صفحات میں سزائے موت کے خاتمے کے پس پردہ محرکات، عالمی اور سیاسی صورتحال کے علاوہ قانونی جائزہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اس مضمون میں اس سزائے موت کے خاتمے کا جائزہ قرآن وسنت کی روشنی میں لیا جائے گا۔

① اسلام رہتی انسانیت تک اللہ کا پسندفرمودہ وہ دین ہے جسے اللہ نے تمام انسانوں کے لئے جامع وکامل بنا کر اپنے نبی محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی نبوت تا قیامت برقرار ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اسلام کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے اور شریعتِ محمدیہ کے تا قیامت برقرار رہنے سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور میں ہونے والی ہر قسم کی ایجاد وترقی سے بخوبی واقف ہونے کی بنا پر پہلے سے ہی شریعت کے ایسے دائمی احکامات نازل فرما چکے ہیں جن میں حالات اور زمان ومکان کی رورعایت رکھی گئی ہے۔ اس بنیادی تصور کو ذہن نشین کر لینے سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ آج کے دور میں بسنے والے انسان لاکھ مہذب ومتمدن ہونے کا دعویٰ کریں، اسلام نے جو سزائیں مختلف جرائم کے لئے رکھ چھوڑی ہیں، ربِّ کریم کا منشا اور ختم نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ آج ان سزاؤں میں کوئی ردّ وبدل کرنے کی بجائے ان کو بعینہٖ تسلیم کرکے جاری وساری کیا جائے۔ مسلمانی کا تقاضا یہی ہے اور مختلف قرآنی آیات کا مفہوم ہمیں اسی بات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلوں کے مطابق ہی اپنی زندگیاں گزاریں، اس سلسلے میں اُنہیں اپنی من مانی یا خود ساختہ ترامیم کا کوئی اختیار نہیں، اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی دو واضح آیات ہیں:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا

www.KitaboSunnat.com

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء:٦٥)

''اے نبیؐ! تیرے ربّ کی قسم، یہ لوگ کبھی بھی ایمان والے نہیں بن سکتے حتیٰ کہ آپ کے فیصلوں کو دل وجان سے تسلیم نہ کرلیں، پھر ان کے دلوں میں اس پر کوئی خَلش باقی نہ رہ جائے جو آپ نے فیصلہ فرمادیا ہے۔ اور یہ اس کو صمیم قلب سے تسلیم کریں۔''

ایسے ہی قرآن کریم کی ایک اور آیت ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾

''کسی مؤمن مرد یا عورت کو یہ لائق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول اس کے لئے کسی بات کا فیصلہ فرمادیں تو پھر اپنے معاملوں میں وہ اپنی مرضی استعمال کریں۔ اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کا نافرمان ہے تو ایسا شخص بلاشبہ واضح گمراہی کا شکار ہے۔'' (الاحزاب:٣٦)

مندرجہ بالا آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے شرعی طور پر یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا واضح فیصلہ مل جانے کے بعد اپنی من مانی کرتا پھرے، قرآنِ کریم کی مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسم اُٹھا کر کہا ہے کہ ایسا شخص کبھی مسلمان نہیں ہوسکتا۔

④ یہاں اس امر کا اظہار بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے دائمی رہنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ شریعت ہر دور میں محفوظ وکامل برقرار رہتی تاکہ اس پر عمل بجا لانا ممکن رہتا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا امتِ محمدیہ پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن وسنت (شریعت) کی حفاظت کی ذمہ داری انسانوں پر ڈالنے کی بجائے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اسلام کا یہی اعجاز اس کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتا ہے اور فی زمانہ قرآنِ کریم کی یہی حفاظت ملتِ اسلامیہ کی وہ بنیادی متاع ہے جس کی بنا پر زوال کے بدترین دور میں بھی مسلمان قرآن کی بنا پر دوبارہ اصل دین کی طرف پل بھر میں لوٹ سکتے ہیں۔ چونکہ باقی شرائع میں حفاظت کا یہ انتظام موجود نہیں، اس لئے آج ان پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ ایک خواہش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سزاے موت کا خاتمہ اور اس نوعیت کے دیگر ایسے بے شمار اقدامات جن کا تقاضا غیر مسلم اقوام مسلمانوں سے کرتی رہتی ہیں، ان کی ایسی مذموم خواہشات کی راہ میں بنیادی رکاوٹ قرآن

کریم ہی بنتا رہتا ہے، جس میں صراحت کے ساتھ شریعتِ مطہرہ کے مسلمات، اساسی عقائد اور مقامِ نبوت کے تقاضے بیان کردیے گئے ہیں۔ اس لئے اللہ کی اس عظیم نعمت کا ملت کو ہردم احساس رہنا چاہئے۔ اسی 'نسخہ کیمیا' کی بنا پر ملتِ اسلامیہ کو اس کی اساسات سے ہٹانا ممکن نہیں۔ کوئی مسلمان کوتاہی یا لاعلمی میں کوئی گناہ تو کرسکتا ہے، لیکن جونہی قرآن مجید کی کوئی آیت یا نبی کریم ﷺ کا کوئی فرمان، جس کی اطاعت کا تقاضا خود قرآنِ مجید ہم سے کرتا ہے، مسلمان کے سامنے آتا ہے، اس کی جبینِ نیاز جھک جاتی ہے۔

③ علاوہ ازیں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ شرعی اور وضعی (انسانوں کے خودساختہ) قانون کے مزاج میں بنیادی طور پر ہی کافی فرق ہے۔ چنانچہ شارع کریم (اللہ تعالیٰ) کے ہاں ظالم کے حقوق اور شرف وعزت کے تحفظ کی بجائے مظلوم ومقتول سے انصاف کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ قتل اور ظلم وستم کا یہ سلسلہ آگے بڑھنے کی بجائے بڑی سختی سے روک دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے قصاص لینے (قاتل کو جواباً قتل کرنے) کو زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ (البقرۃ:۱۷۹) اور دیت وصول کر لینے کے بعد کسی کو قتل کرنے کی نبی کریم نے انتہائی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے کہ میں اس کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ (السنن الکبریٰ از امام بیہقیؒ: ۵۴؍۸)

جبکہ انسانوں کے خودساختہ قانون میں تمام رعایتیں اور حقوق کو مجرم کے لئے مخصوص کرتے ہوئے مظلوم کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ یہاں ہمدردی اور انسانی حقوق کا فائدہ مظلوم کو ملنے کی بجائے ظالم اور مجرم کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجرم کے انسانی حق کے تحفظ کے لئے دنیا بھر میں سزائے موت کے خاتمے کی تحریک چلائی جارہی ہے جب کہ شریعت کی نظر میں جو شخص اپنے شرفِ انسانیت کا خود تحفظ نہ کرے، تو اس آدمی کو ہمدردی اور احترام کا کوئی حق حاصل نہیں، اللہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرکے ایسا شخص خود اپنے شرف اور حق کو ضائع کربیٹھتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ (الحج:۱۸)

''جس کو اللہ رسوا کردے تو اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔''

ایسے ہی قرآن کریم نے زنا یا دیگر جرائم کی سزاؤں میں یہ لازمی قرار دیا ہے کہ

﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النور:۲)

www.KitaboSunnat.com

''ان کی سزا کے موقع پر مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہونی چاہئے۔''

اس اظہار اور شہرت کے پس پردہ شریعت کا یہ تصور بھی موجود ہے کہ دیگر لوگ بھی ایسی کوتاہی کرنے سے عبرت پکڑیں۔ گویا اسلام چند مجرموں کو سنگین سزا دے کر باقی انسانیت کو جرائم سے تحفظ دینا چاہتا ہے۔ اور اسلامی سزاؤں کی یہ سنگینی سدذریعہ کے طور پر ہے۔

وضعی قانون میں ثبوتِ جرم اور اس کو سزا دلوانے کے سارے عمل میں شک واحتمال کا فائدہ مجرم کو حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ قانونِ وضعی سے وابستہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مجرم قانون کا لاڈلا بیٹا ہوتا ہے اور قانون کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مظلوم کے برعکس ظالم سے کوئی زیادتی نہ ہوجائے، یہی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پسندی ظالم کو مزید ظلم کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

④ اسلام کے پیش نظر سزاؤں کے فلسفے میں یہ بات بھی موجود ہے کہ جس شخص نے دنیا میں سزا کاٹ لی، اس کے لئے آخرت میں کوئی سزا موجود نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں واضح طور پر یہ آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مجلس میں صحابہ کرامؓ سے کہا:

''تم مجھ سے بیعت کرو کہ تم شرک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا اور قتل نہ کرو گے، بہتان طرازی نہ کرو گے، اور جائز بات میں نافرمانی نہ کرو گے۔ جو مسلمان ان اُمور کو بجالایا تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے «ومن أصاب من ذلك شيئًا فعُوقب في الدنيا فهو كفارة له ومن أصاب من ذلك شيئًا فَسَتَره الله فأمرُه إلى الله إن شاء عاقبه وإن شاء عفا عنه ، فبايعناه على ذلك» (صحیح بخاری:۷۲۱۳)

''اور جس کسی نے ان باتوں میں سے کسی کا ارتکاب کرلیا اور اسے دنیا میں اس کی سزا دے دی گئی تو یہ سزا اس کے لئے کفارہ بن گئی اور جس شخص نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اس کا انجام اللہ کے ہاں ہے، چاہے تو اس کو روزِ قیامت سزا دے گا اور چاہے تو معاف فرمادے گا۔ چنانچہ ہم نے اس پر نبی کریم ﷺ سے بیعت کی۔''

ایسے ہی احادیث میں متعدد واقعات ذکر ہوئے ہیں جن میں جرم کا ارتکاب کرنے والے صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر اپنے آپ کو پاک کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ وہ قیامت کو ملنے والی سزا کی بجائے دنیا میں ہی اس کا بدلہ لے کر عافیت پانا چاہتے ہیں۔ اسلام کے فلسفہ جرم وسزا کا یہ پہلو چونکہ نادر اور دیگر قوانین سے خصوصی امتیاز

www.KitaboSunnat.com

کا حامل ہے، اس لئے اس کے بعض واقعات یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

۱) ایک صحابی ماعزؓ بن مالک سے زنا کا جرم سرزد ہوگیا تو دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر اُنہوں نے تین مرتبہ اپنے آپ کو پاک کرنے کی فریاد کی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «فیم أُطهِّرك؟» (صحیح مسلم:۱۶۹۵) میں تجھے کس سے پاک کروں؟ تو حضرت ماعزؓ نے زنا کا اعتراف کیا، چنانچہ تصدیق وتاکید کے بعد اُنہیں نبی کریم نے رجم کرنے کا حکم دیا۔

۲) ایسے ہی ایک غامدیہ عورت نے نبی کریم ﷺ سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ عورت دو تین سالوں میں کئی بار نبی کریم کے پاس آئی اور آپ سے سزا پانے کی گذارش کی، آخر تمام تقاضے پورے ہوجانے پر نبی کریمؐ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ (صحیح مسلم:۱۶۹۵)

۳) سمرہ بن حبیبؓ نامی ایک صحابی کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک اونٹ کی چوری کا اعتراف کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنے آپ کو پاک کرنے اور سزا پانے کے لئے پیش کردیا۔ چوری کی تصدیق ہوجانے کے بعد جب اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تو راویٔ حدیث ثعلبہ کہتے ہیں کہ وہ زبان سے یوں کہہ رہا تھا: اَلْحَمْدُ للهِ الَّذِي طَهَّرَنِي مِنْكِ أَرَدْتِ أَنْ تُدْخِلِي جَسَدِيَ النَّارَ (ضعیف سنن ابن ماجہ: رقم ۵۶۲)

''تمام تعریفیں اس ذات کے لئے جس نے مجھے (اے ہاتھ) تجھ سے پاک کردیا، تو چاہتا تھا کہ میرے سارے جسم کو آگ میں داخل کردے۔''

۴) نبی کریم کے سامنے ایک چور کو لایا گیا جو چوری کا خود اعتراف کررہا تھا لیکن اس سے مالِ مسروقہ برآمد نہیں ہوسکا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے کہا کہ میں تمہیں چور نہیں خیال کرتا، لیکن وہ شخص اپنے چور ہونے پر بار بار اصرار واعتراف کرتا رہا۔ چنانچہ اس بنا پر نبی کریم ﷺ نے اس کا ہاتھ کٹوا کر اس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعاے خیر کی۔ (سنن نسائی: رقم ۴۸۷۷)

۵) حضرت علیؓ کے سامنے ایک عورت شراحہ نے اعترافِ زنا کیا تو حضرت علیؓ نے اس کو ٹالنے کی کوشش کی اور کہا:

''شاید کہ تجھ سے زنا بالجبر ہوا ہو، شاید کہ تیرا شوہر تیرے پاس آیا ہو، شاید یہ اور یہ لیکن وہ عورت بولی: نہیں۔ سو جب اس عورت نے بچہ جن دیا جو اس کے پیٹ میں تھا تو آپ نے

www.KitaboSunnat.com

(جمعرات کو) اسے ۱۰۰ کوڑے مارے اور (جمعہ کو) رجم کردیا۔''

(مسند احمد: ۱؍۱۰۷، ۱۴۳، صحیح بخاری: ۶۸۱۲، إرواء الغلیل: ۲۳۴۰ 'صحیح')

الغرض یہ اسلام ہی ہے جس نے جرائم کا دنیا وآخرت دونوں میں مؤاخذے کا تصور دے کر معاشرے سے جرائم کا قلع قمع کیا، کیونکہ ظاہری وسائل، پابندیاں اور قوانین آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی اس قابل نہیں کہ انسان کو جرم سے روک سکیں، اِلا یہ کہ وہ خود رب کے سامنے اپنے مؤاخذے سے فکر مند نہ ہو جیسا کہ جدید ممالک میں جرم وسزا کے اعداد وشمار اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے بالمقابل کتبِ حدیث میں خود اعترافِ جرم کے متعدد واقعات موجود ہیں، جہاں عنداللہ مسئولیت سے بچنے کے لئے مسلمانوں نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردیا۔ اور اس دور میں بھی جہاں جہاں اسلامی قانون اپنی روح کے ساتھ نافذ ہے، وہاں جرائم کی شرح دنیا بھر سے حیرت انگیز حد تک کم ہے۔

موجبِ قتل جرائم

مذکورہ بالا تمہیدی نکات کے بعد ان جرائم کا مختصراً تذکرہ جن کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ نے قتل کی سزا عائد کی ہے:

① جو شخص بھی اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے تو اس کی سزا قتل ہے جیسا کہ واضح فرمانِ نبویؐ ہے: «من بدّل دینه فاقتلوه» (صحیح بخاری: ۲۵۲۴)

''جو مسلمان بھی اپنا دین تبدیل کرے تو اس کو قتل کردو۔''

الفقه الإسلامي وأدلته میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی أحکام المُرتد کے تحت مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماعِ اُمت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اتفق العلماء علی وجوب قتل المرتد لقوله ﷺ:«من بَدَّل دینه فاقتلوه» وقوله علیه السلام: «لایحل دم امرئ مسلم إلا بإحدٰی ثلاث: الثیب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدینه المفارق للجماعة» وأجمع أهل العلم علی وجوب قتل المرتد. (جلد۶؍صفحہ۱۸۶)

''علما کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کا قتل واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو

مسلمان اپنا دین بدل لے، اسے قتل کردو۔ نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال اور مباح نہیں ہوتا مگر تین صورتوں میں: ایک یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی جان کا قاتل ہو اور تیسرے یہ کہ وہ دین کو چھوڑ دے، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مرتد واجبِ قتل ہے۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۷ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۴ میں بھی مرتد کی وعید موجود ہے۔

☜ یاد رہے کہ دستورِ پاکستان میں آئین توڑنے کی سزا موت قرار دی گئی ہے۔(دفعہ ۶) ایسے ہی ملک سے بغاوت کی سزا بھی قتل مقرر کی گئی ہے۔(دفعہ ۱۲۳/اے)

② شادی شدہ زانی کی سزا رجم☆ ہے، فرمانِ نبویؐ ہے:

«البكر بالبكر جلد مائة ونفي سنة والثيب بالثيب جلد مائة والرجم»

''غیر شادی شدہ کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ کو کوڑے اور رجم کی سزا دی جائے گی۔'' (صحیح مسلم:۱۶۹۰)

☜ یاد رہے کہ یہی سزا پاکستان کے فوجداری قانون میں بھی حد زنا آرڈیننس کی دفعہ ۵ کے کی شق ۲ کے تحت موجود ہے اور تحفظِ خواتین ایکٹ ۲۰۰۶ء میں اس کو برقرار رکھا گیا ہے۔

③ **قصاص:** قرآنِ کریم میں واضح طور پر اللہ کا فرمان ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ * وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۷۸،۱۷۹)

''ایمان والو! تم پر قتل کے سلسلے میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد مرد کو قتل کیا جائے اور غلام کے بدلے غلام کو، عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے۔ البتہ جس کو اس کے بھائی نے معاف کردیا تو معروف طریقے سے اس کا خون بہا مقرر کرنا اور احسان مندی

☆ ان دونوں سزاؤں کی تفصیل اور متعلقہ آیات واحادیث کے لئے محدث کے دو مستقل مضامین ملاحظہ فرمائیں: قتل مرتد (فروری ۲۰۰۷ء) اور حدّ رجم (دسمبر ۲۰۰۸ء)

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ ادائیگی کرنا ہے۔ یہ تمہارے ربّ کی طرف تم پر تخفیف اور رحمت ہے، جو شخص اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اہل عقل ودانش! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم ربّ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

مندرجہ بالا تینوں جرائم جن کی سزا قتل ہے، کا تذکرہ اس فرمانِ نبویؐ میں یکجا ہوا ہے:

«لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بإحدى ثلاث: النفس بالنفس والثيب الزاني والمفارق لدينه التارك للجماعة» (صحیح بخاری:٦٨٧٨)

''کسی مسلمان کا خون جائز نہیں جب کہ وہ یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین حالتوں میں اس کا خون مباح ہوگا۔ پہلی یہ کہ قصاص کی حالت میں، دوسری یہ کہ شادی شدہ زانی ہونے کی صورت میں اور تیسری یہ کہ دین کو چھوڑنے اور مسلمانوں سے الگ ہونے کی شکل میں۔''

☜ یاد رہے کہ یہ سزا پاکستانی قانون میں بھی موجود ہے۔ مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ نمبر ۳۰۲ کی شق ب ملاحظہ ہو:

''جو شخص قتل کا مرتکب ہوگا، اسے قصاص کے طور پر موت کی سزا دی جائے گی۔''

④ حرابہ یعنی ڈاکہ اور زمین میں فساد پھیلانا وغیرہ جو اللہ سے جنگ کے مترادف ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ ودو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلا وطن کر دیئے جائیں۔ یہ ذلت ورسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔'' (المائدۃ:٣٣)

www.KitaboSunnat.com

قرآنِ کریم کی ایک اور آیت میں سزائے موت کے جرم نمبر۳ اور۴ یکجا بیان ہوئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سزائیں صرف اسلام میں ہی نہیں بلکہ یہود یت وعیسائیت میں بھی موجود تھیں، ملاحظہ فرمائیں:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ:۳۲)

''اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔''

اس آیت میں سزائے موت کا پہلا جرم جان کے بدلے جان اور دوسرا جرم فساد فی الارض قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ نبی کریم ﷺ کا ایک فرمان روایت کرتی ہیں:

«لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدًا رسول الله إلا في إحدٰى ثلاث: رجل زنىٰ بعد إحصان فإنه يرجم ورجل خرج محاربًا بالله ورسوله فإنه يقتل أو يصلب أو ينفى من الأرض أو يَقتل نفسا فيُقتل بها» (سنن ابوداود:۴۳۵۳، قال الالبانی:'صحیح')

''کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں ہے جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، مگر تین صورتوں میں اس کا خون مباح ہوجاتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے، اس جرم پر اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ/ بغاوت کرے تو اسے قتل کیا جائے گا یا اسے سولی دی جائے گی یا اسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی کو قتل کر دے تو اس پر اسے بھی (قصاص کے طور پر) قتل کر دیا جائے گا۔''

موت کی مندرجہ بالا سزائیں تو متفقہ ہیں، البتہ شریعتِ اسلامی میں موت کی بعض سزائیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں علماے کرام میں اتفاق نہیں، یا وہ جرائم ایسے ہیں جن کی سزا اوّل مرحلہ میں تو موت نہیں، البتہ آخر کار اُنہیں سزائے موت دی جائے گی یا دی جاسکتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

⑤ توہین رسالت کو بھی ارتداد کے تحت ہی لاتے ہوئے اس کی سزا قتل قرار دی گئی ہے، جیسا کہ خود نبی کریم ﷺ نے متعدد صحابہ کرامؓ کو بھیج کر گستاخانِ رسول کو قتل کرایا۔

✳ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فرمان ہے:

أَيُّمَا مُسْلِمٍ سَبَّ اللهَ وَرَسُولَهُ أَوْ سَبَّ أَحَدًا مِنَ الأَنْبِيَاءِ فَقَدْ كَذَبَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ وَهِيَ رِدَّةٌ يُسْتَتَابُ فَإِنْ رَجَعَ وَإِلاَّ قُتِلَ وَأَيُّمَا مُعَاهِدٍ عَانَدَ فَسَبَّ اللهَ أَوْ سَبَّ أَحَدًا مِنَ الأَنْبِيَاءِ أَوْجَهَرَ بِهِ فَقَدْ نَقَضَ الْعَهْدَ فَاقْتُلُوهُ (زادالمعاد ۵/۶۰)

''جس مسلمان نے اللہ یا اس کے رسول یا انبیا میں سے کسی کو گالی دی، اس نے اللہ کے رسول ﷺ کی تکذیب کی، وہ مرتد سمجھا جائے گا اور اس سے توبہ کروائی جائے گی، اگر وہ رجوع کرلے تو ٹھیک، ورنہ اسے قتل کردیا جائے گا اور جو معاہدہ کرنے والا شخص خفیہ یا اعلانیہ، اللہ یا کسی نبی کو بُرا کہے تو اس نے وعدے کو توڑ دیا، اس لئے اسے قتل کردو۔''

✳ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا فرمان ہے:

لا والله ما كانت لِبَشر بعد محمد ﷺ (سنن ابوداؤد: ۴۳۶۳ 'صحیح') مختصراً

''اپنی توہین کرنیوالے کو قتل کروادینا محمد ﷺ کے علاوہ کسی کے لئے روا نہیں ہے۔''

✳ حضرت عمرؓ کے پاس ایک آدمی لایا گیا کہ وہ نبی ﷺ کو برا بھلا کہتا تھا تو فرمایا:

من سبَّ اللهَ أو سبَّ أحدا من الأنبياء فاقتلوه (الصارم المسلول: ص۴۱۹)

''جس نے اللہ کو یا انبیاے کرامؑ میں سے کسی کو گالی دی تو اسے قتل کردیا جائے۔''

✳ حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ ''جس نے رسول اللہ ﷺ کی توہین کی، اس کی گردن ماردی جائے۔'' (مصنف عبدالرزاق: ج۵/ص ۳۰۸)

☜ پاکستانی قانون میں یہ سزا☆ موجود ہے، دیکھیں قانون توہین رسالت کی دفعہ ۲۹۵ ج

''آں حضرت ﷺ کے مقدس نام کی بذریعہ الفاظ، زبان، تحریر یا دکھائی دینے والی اشکال کے ذریعے یا بذریعہ تہمت یا طعن آمیز اشارے یا در پردہ الزام کے ذریعے، براہِ راست یا بالواسطہ توہین کرے گا، تو اسے سزاے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی، اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔'' (مجموعہ تعزیرات پاکستان: دفعہ ۲۹۵ ج)

☆ اس سزا کی مزید تفصیل اور احادیث کے لئے دیکھیں محدث کا شمارۂ مارچ ۲۰۰۸ء

www.KitaboSunnat.com

⑥ **جاسوس کی سزا:** اس پر حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا واقعہ دلیل ہے جب اُنہوں نے اہل مکہ کی نبی کریم کی پیش قدمی کے بارے میں بعض تفصیلات فراہم کیں اور نبی کریم کے علم میں آ گیا تو اس موقع پر حضرت عمرؓ نے کہا:

دعني يا رسول الله أضرب عُنق هذا المنافق (صحیح بخاری: ۳۰۰۷)

''اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیں، میں اس منافق کی گردن مار دوں۔''

لیکن نبی ﷺ نے حاطبؓ کے بدری صحابی ہونے کی بنا پر حضرت عمرؓ کو اجازت نہ دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے تمام گناہ معاف فرما دیے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

''جاسوس کو قتل کرنا حاکم کی رائے پر موقوف ہے، اگر وہ اسے قتل کرنے میں مصلحت سمجھے تو قتل کروا دے وگرنہ اس کو زندہ رہنے دے۔'' (زاد المعاد: ۴۲۲/۳)

⑦ شریعتِ اسلامیہ میں عادی چور کی سزا بھی قتل ہے، جیسا کہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص کو چار بار چوری کی سزا میں پکڑا گیا، اور نبی اکرم ﷺ کے فیصلے کی بنا پر ہر بار اس کا ایک ہاتھ یا پاؤں کاٹا جاتا رہا۔ جب اسے پانچویں بار لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

فَأُتِيَ بِهِ الْخَامِسَةَ فَقَالَ: «اقْتُلُوهُ» قَالَ جَابِرٌ فَانْطَلَقْنَا بِهِ فَقَتَلْنَاهُ ثُمَّ اجْتَرَرْنَاهُ فَأَلْقَيْنَاهُ فِي بِئْرٍ وَرَمَيْنَا عَلَيْهِ الْحِجَارَةَ (صحیح سنن ابو داود: رقم ۳۷۱۰)

''جب اسے پانچویں مرتبہ لایا گیا آپ ﷺ نے فرمایا: اسے قتل کر دو۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم اسے لے کر لے چلے، اور ہم نے اس کو قتل کر دیا۔ پھر اسے کھینچ کر ایک کنویں میں ڈال دیا اور اوپر سے پتھر وغیرہ پھینک دیے۔''

⑧ جادوگر کی سزا بھی قتل ہے جیسا کہ حضرت جندبؓ نبی ﷺ کا فرمان ذکر کرتے ہیں کہ «حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيفِ» (سنن کبریٰ بیہقی ۱۳۶/۸؛ ضعیف سنن ترمذی: ۲۴۴)

''حضرت جندبؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جادوگر کی سزا یہ ہے کہ اسے تلوار سے قتل کر دیا جائے۔''

⑨ ایک خلیفہ کے بعد دوسرے خلیفہ کی بیعت کی جانے لگے تو دوسرے خلیفہ کو قتل کر دیا جائے جیسا کہ فرمانِ نبویؐ ہے:

«إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَينِ فَاقْتُلُوا الآخِرَ مِنْهُمَا» (صحیح مسلم: رقم ۱۸۵۳)

www.KitaboSunnat.com

''جب دو خلیفوں کی بیعت کی جانے لگے تو دوسرے کو قتل کردو۔''

ایسے ہی زندیق اور تارکِ نماز وغیرہ کی سزا کے بارے میں بعض علما کا موقف ہے کہ اُنہیں اپنے فعل پر اصرار کی وجہ سے آخر کار قتل کیا جاسکتا ہے۔ نیز مسلمانوں کے خلاف تلوار اُٹھانے والے کا خون بھی فرمان نبوی کی رو سے رائیگاں ہے۔ (صحیح سنن ابوداود:۳۷۷۲)

نبی کریم ﷺ کا خود قتل کی سزا دلوانا

محمد ﷺ کا یہ وصف قرآنِ کریم میں بیان ہوا کہ آپ رحمت للعالمین ہیں۔(الانبیاء:۱۰۷) لیکن اس عظیم وصف 'مجسمۂ رحمت' ہونے کے باوجود مجرموں سے آپ رحمت کا سلوک کرنے کی بجائے ان کو قرارِ واقعی سزا دیا کرتے کیونکہ اوّل تو ان سزاؤں کو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اور آپ ﷺ کو بھی ان میں ترمیم وتنسیخ کا کوئی اختیار نہیں تھا، علاوہ ازیں ان سزاؤں کا اجرا آخرت میں ان مجرموں کے لئے مغفرت کا سبب قرار پاتا ہے، جیسا کہ آغاز میں فرمانِ نبویؐ گزر چکا ہے۔ یوں بھی سدذریعہ کے طور پر یہ سزائیں دے کر ہی معاشرے سے جرائم کا قلع قمع کیا جانا اور دوسرے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا ممکن ہوسکتا ہے۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات بے شمار ہیں جب آپ نے خود قتل کا حکم صادر فرمایا، بطورِ مثال

❁ رجم کی سزائیں آپ نے خود صادر فرمائیں۔ آپ کے حکم سے رجم کی سزا پانے کے واقعات کم وبیش ۸ ہیں جن کی تمام احادیث کا مکمل متن اور ترجمہ محدث کے شمارۂ دسمبر ۲۰۰۶ء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

❁ توہین رسالت کے ۱۶ واقعات میں گستاخوں کو قتل کیا گیا، جن میں سے ۵ واقعات میں ۹ مردوں اور ۲ عورتوں کے قتل کا آپ نے خود حکم صادر فرمایا اور باقی ۱۱/ واقعات میں صحابہؓ نے ازخود اُنہیں قتل کیا تو آپ نے واقعہ کی تفتیش کے بعد گستاخی ثابت ہونے پر ایسے گستاخوں کے قتل کو رائیگاں قرار دیا۔ بلکہ ۴ ملعون گستاخ تو ایسے ہیں، جن کے قتل کے لئے نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ صحابہ کی مہمات روانہ کیں۔ ایسے تمام واقعات کی تفصیل کے لئے راقم کا مضمون دیکھئے: ''احادیث میں توہین رسالت کے واقعات اور ان کی سزائیں'' (محدث: مارچ ۲۰۰۸ء)

❁ چار نامراد لوگوں کے بارے میں تو نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ

www.KitaboSunnat.com

«اقتلوهم وإن وجدتموهم متعلقين بأستار الكعبة : عكرمة بن أبي جهل وعبد الله بن خطل ومقيس بن صبابة وعبد الله بن سعد بن أبي السرح»

''اگر یہ لوگ کعبہ کے پردوں سے چمٹے ہوئے بھی مل جائیں تو ان کو قتل کردیا جائے: عکرمہ بن ابوجہل، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن ابوسرح۔'' (صحیح بخاری:۱۸۴۶)

ان میں آخر الذکر شخص کا جرم ارتداد تھا۔ (فتح الباری:۹۵/۱۲)

❁ نبی کریم ﷺ نے 'نبی رحمت' ہونے کے باوجود ارتداد، حرابہ اور فساد فی الارض کی اس قدر سنگین سزا دی کہ انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کا جرم بڑا سنگین تھا، اس سزا کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیے تاکہ اسلام کے تصورِ سزا کے بارے میں ہمارے ذہن میں جنم لینے والے شبہات واعتراضات رفع ہوسکیں اور ہم اپنے نبی ﷺ کے قول وفعل پر ایمان لاتے ہوئے ان سزاؤں کو نعوذ باللہ وحشیانہ یا سنگین ہونے کا خیال جڑ سے اُکھاڑ دیں۔

یہ واقعہ مختصراً یہ ہے کہ دورِ نبویؐ میں کچھ لوگ اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگئے، اور بیت المال کے نگران کو قتل کرنے کے بعد بیت المال کے اونٹ ہنکا کر لے گئے تو

فَبَلَغَ ذَلِكَ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَأَرْسَلَ فِي آثَارِهِمْ فَأُدْرِكُوا فَجِيءَ بِهِم فَأَمَرَ بِهِم وَقُطِّعَتْ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ وَسَمَرَ أَعْيُنَهُمْ ثُمَّ نَبَذَهُم فِي الشَّمْسِ حَتَّى مَاتُوا قَالَ أَبُوقِلَابَةَ وَأَيُّ شَيءٍ أَشَدُّ مِمَّا صَنَعَ هَؤُلاَءِ إِرْتَدُّوا عَنْ الإِسْلاَمِ وَقَتَلُوا وَسَرَقُوا (صحیح بخاری:۶۸۹۹)

''یہ معاملہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے ان کے پیچھے صحابہ کو بھیجا اور وہ پکڑ لیے گئے چنانچہ اُنہیں آپ ﷺ کے پاس لایا گیا اور ان کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے گئے اور ان کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیری گئیں، پھر اسی طرح اُنہیں دھوپ میں پھینک دیا اور آخر وہ مرگئے۔ ابوقلابہؒ کہتے ہیں کہ جو کام اُنہوں نے کیا تھا، کیا اس سے بڑھ کر کوئی جرم ہوسکتا ہے؟ وہ اسلام سے مرتد ہوئے، قتل وغارت کی اور چوری کا ارتکاب کیا۔''

سزائے قتل اور شریعت کی سہولت

اسلام میں سزائے قتل اور دیگر سزاؤں کے وحشیانہ ہونے پر اہل مغرب کی طرف سے کئی

www.KitaboSunnat.com

اعتراض کئے جاتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اسلام کے مکمل نظام سے واقف نہیں ہیں، صرف بدنام کرنے کے لئے ایسے اعتراضات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً

✍ قصاص میں مقتول کے ورثا اس قدر زیادہ رقم کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی ادائیگی ناممکن ہو، اس لحاظ سے یہ قاتل پر زیادتی کے مترادف ہوجاتا ہے۔ جبکہ یہ اعتراض لاعلمی کا نتیجہ ہے، اوّل تو یہ اعتراض مقتول پر ہونے والے ظلم کو نظر انداز کرنے یا کمتر جاننے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے نیز قرآن نے اتباع بالمعروف کی شرط لگا کر معروف خون بہا کی شرط بھی عائد کردی ہے۔

✍ پھر اسلام نے قصاص کو معاف کرنے کا اِمکان بھی پیدا کیا ہے، اور اس سلسلے میں قصاص معاف کرنے کی شریعت میں بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے، فرمانِ نبویؐ ہے:

«مَنْ تَصَدَّقَ بِدَمٍ فَمَا دُونَهُ كَانَ كَفَّارَةً لَهُ مِنْ يَومِ وُلِدَ إِلَى يَومِ تَصَدَّقَ بِهِ»

(مجمع الزوائد ٦/ ٣٠٢ رجال إسناده رجال الصحيح)

''جس نے خون یا اس سے کم کا صدقہ کیا (مراد اپنا خون وغیرہ معاف کردیا) یہ صدقہ اس کے لئے اس کے پیدائش کے دن سے لے کر صدقے کے دن تک کا کفارہ ہے۔''

✍ اسلام نے قصاص کے خاتمے کیلئے ورثا میں سے ہر ایک کو معافی کا استحقاق دیا ہے، حتیٰ کہ یہ حق خواتین بھی استعمال کرسکتی ہیں، حضرت عائشہؓ نے یہ فرمانِ نبویؐ روایت کیا ہے:

«عَلَى الْمُقْتَتِلِينَ أَنْ يَنْحَجِزُوا الأَوَّلَ فَالأَوَّلَ وَإِنْ كَانَتِ امْرَأَةً»

''مقتول کے ورثا کو چاہئے کہ وہ قصاص معاف کردیں اور یہ حق قریب سے قریب تر وارث کو حاصل ہے، اگرچہ وہ عورت ہی ہو۔'' (صحیح سنن ابوداود: ۴۵۳۸)

✍ اسلام حاکم کو یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ مقتولین کے ورثا کو قصاص کی بجائے دیت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے ابوجہم نامی شخص سے قصاص لینے پر لیث قبیلہ کو بڑی محنت سے راضی کیا کہ وہ قصاص کی بجائے دیت لینے پر آمادہ ہوجائیں، آخرکار ان کے آمادہ ہوجانے پر ان کو غیر معمولی دیت دے کر قصاص کا خاتمہ کروالیا۔ (صحیح سنن ابوداود: ۳۸۰۱)

ترسیل محدث کے سلسلے میں اطلاع وشکایت کے لئے درج ذیل موبائل پر رابطہ کریں

0333-4244434

جبکہ مدیر 'محدث' کے موبائل پر صرف مضامین وتبصرہ کے بارے میں رابطہ کریں۔

www.KitaboSunnat.com

دورِ حاضر

محمد سرور☆

اعتدال پسندی یا مغرب پرستی؛ چند تاثرات

موجودہ دور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکری یلغار کا دور ہے۔ ہمارے حریف نے جب ہمیں میدانِ جنگ میں ناقابلِ تسخیر پایا تو اس نے نظریاتی محاذ پر ہمیں فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔ دشمن کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہی قوم جو شمشیر و سناں کے میدان میں ناقابلِ شکست تھی فکری محاذ پر دشمن کے سامنے نیم بسمل آہو کی طرح ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ اس نے جس نظریے اور سوچ کو جس انداز میں بھی ہمارے ذہنوں میں اُتارنا چاہا، ہم نے اسے بسروچشم قبول کیا۔ اس نے جس چیز کو اچھا کہا، ہم نے بھی اس کے لئے سندِ تحسین جاری کردی اور جس چیز کو قابل نفرت گردانا، ہم اس سے اپنا دامن بچانے کو اپنے لئے لائقِ صد افتخار جاننے لگے۔ حتیٰ کہ اپنی اَقدار و روایات کو فراموش کر کے فرنگی تہذیب کے دامِ فریب میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے اور اس کے اعضائے ترکیبی اور عارض و رخسار کی رنگینی کچھ اس انداز سے جی کو بھائی کہ جسم کا انگ انگ سرشاری و سرمستی کے عالم میں پکار اُٹھا ؎

سرمایۂ نشاط تری ساقِ صندلی
بیعانۂ سرور ترا مرمریں بدن

چنانچہ یہ بات بھی اسی سوچی سمجھی سازش کا حصہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی ہر منفرد خوبی اور اچھائی کو جو اسلام اور اہل اسلام کے لئے سرمایۂ ناز ہو، کسی ایسے مفہوم میں رنگ دیا جائے جس سے مسلمانوں کو روحِ اسلام سے دور لے جا کر لاشعوری طور پر اپنے مخصوص نظریات و مقاصد کا ہم نوا بنا لیا جائے اور دوسری طرف ہر ایسی برائی کو جسے اپنانے سے نوعِ انسانی کی اکثریت گریزاں ہو، معنی و مفہوم کے کسی ایسے سانچے میں ڈھال دیا جائے جس سے خود مسلمانوں کو اپنا دامن اس برائی میں ملوث نظر آنے لگے اور یوں اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت کی وہ خوبیاں جو اَزل سے انسان کی سرشت میں داخل ہیں، ان کا رخ اسلام کے خلاف موڑ کر

☆ متعلّم مرکز التربیۃ الإسلامیۃ، فیصل آباد

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کو بالخصوص اور دیگر مذاہب سے وابستہ لوگوں کو بالعموم اسلام سے دور کیا جاسکے۔ چنانچہ اسی منصوبہ کے تحت موجودہ دور میں جہاں دہشت گردی، بنیاد پرستی اور روشن خیالی جیسی معروف اور مسلمہ اَقدار و روایات کو معانی و مفاہیم کے نئے لبادے اوڑھا دیئے گئے ہیں، وہاں اعتدال اور میانہ روی جیسی خوبی کے حقیقی معنی کو بھی غلط مفہوم کے لباس میں چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ باور کروایا جارہا ہے کہ اعتدل پسندی سے مراد یہ ہے کہ ہر جائز وناجائز نظریے کو صحیح سمجھا جائے، ہر روا و ناروا عقیدے کو برداشت کیا جائے اور ہر غلط اور صحیح اندازِ فکر کو درست تسلیم کر لیا جائے، اگرچہ دلائل وشواہد کی تمام کڑیاں اس کے خلاف گواہی دے رہی ہوں۔ بقولِ اکبرالہ آبادی ؎

مغوی کو بُرا مت کہو، ترغیب ہے یہ میں کس سے کہوں، نفس کی تخریب ہے یہ
شیطان کو 'رجیم' کہہ دیا تھا اِک دن ایک شور اُٹھا، خلافِ تہذیب ہے یہ!!

جبکہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے دانشور حضرات مغرب سے درآمد شدہ کسی بھی نظریے اور سوچ کی تشہیر وتبلیغ میں غیروں سے بھی نہ جانے کتنے ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس طرزِ عمل کو کس نام سے موسوم کیا جائے کہ یہ حلقۂ یاراں میں تو اپنے اسلام اور ایمان کے مماثل کسی کے ایمان کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن بیگانوں سے نگاہیں دوچار ہوتے ہی ان کو اپنا وہ ایمان بھی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ معلوم ہونے لگتا ہے جس کو خود ان کے اپنے قلوب و اذہان نے اپنے مخصوص پیمانے کے ذریعے قرآن وسنت سے کشید کیا ہوتا ہے۔

ہمارے یہ دانشور اسی مخصوص سوچ اور نظریے کے تحت اعتدال کے اس مفہوم کا لوگوں کو درس دے رہے ہیں جو اہل مغرب کو سجھائی دیا ہے اور وہ مفہوم یہ ہے کہ اپنے مذہب، عقیدے اور سوچ سے اسی قدر وابستگی رکھنی چاہئے جس سے ہر مسلک، ہر عقیدے اور ہر مذہب سے وابستہ شخص کی تسکین کا سامان ہوسکے، جو ہر کسی کے ہاں قابل قبول ہو اور بعض 'ناگزیر' قسم کے حالات میں اپنے رہے سہے عقیدہ سے بھی دستبردار ہونا پڑے تو بلا تامل یہ قربانی بھی دے دینی چاہئے۔ یہ نظریہ کہاں تک درست ہے؟ اس سے بین المِلّی مصالحت کے کتنے امکانات اُبھرتے ہیں؟ اور یہ مذہب سے بیزار لوگوں کے لئے خوشحالی کے کتنے پہلو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے؟ فی الحال ان سوالات کو نظر انداز کیجئے، سردست صرف اتنی بات پر غور کیجئے کہ اس نظریے کے اوّلین خالق خود کہاں تک اپنے اس فلسفے پر عمل پیرا ہیں؟

www.KitaboSunnat.com

ہمیں اس بات سے غرض نہیں ہے کہ وہ تو اپنے اصل مذہب سے پہلے ہی بہت دور جا چکے ہیں۔ بلکہ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ان کے اپنے نفس اور خواہش نے جس چیز کو بھی ان کی آنکھوں میں مذہب بنا کر دکھایا ہے، وہ اس میں رواداری اور نرمی کے کہاں تک قائل ہیں؟ کیا وہ لوگ خود اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں جس کے تحت اُنہوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے؟ یعنی تصادم سے گریز، دوسروں کی رائے کا احترام اور اپنے قلوب و اذہان کو ہر قسم کی مذہبی، علاقائی اور نسلی عصبیت سے پاک رکھنا.....

اس سوال کا جواب کسی بھی صاحبِ بصیرت شخص پر مخفی نہیں ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس نوع کے سارے نظریے، ساری اصطلاحیں، سارے الفاظ اور سارے خرخشے صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں، کیونکہ ان لوگوں کے ہاں اگر کوئی مذہب شدت پسند ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بنیاد پرستی صرف مسلمانوں کا وصف ہے۔ تعجب ہے ان دانشورانِ ملت پر جو اس ساری سازش سے واقف ہوتے ہوئے بھی برابر ان کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں۔

؎ اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں ہے

مرے تھے جن کے لئے.....!

اہل مغرب کا نسل انسانی سے ملّی، مذہبی، قومی اور علاقائی تعصب کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کا طومار باندھنا پڑے۔ بالخصوص حالیہ چند برسوں کے دوران 'تہذیب' کے ان علمبرداروں کا چہرہ جس طرح بے نقاب ہوا ہے اور ان کے خانہ ساز نظریۂ اعتدال کی قلعی جس انداز میں کھلی ہے، وہ پوری دنیا کے سامنے ہے۔ ان کا یہ کردار جو بالخصوص نائن الیون کے بعد سے اب تک سامنے آیا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہ وہ 'گراں قیمت ترکہ' ہے جو اس 'مہذب قوم' کو اپنے آباء و اجداد سے تسلسل کے ساتھ بطورِ ورثہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ صدیوں پر محیط اس رودادِ ظلم میں سے صرف ایک مثال دیکھئے:

''تاریخ کا یہ بے لاگ تجزیہ ہے کہ اگر مسلمان سپین اور سسلی نہ جاتے تو یورپ بداخلاقی کی اتھاہ گہرائیوں سے کبھی نہ نکل پاتا، لیکن مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ عہدِ حکومت کے بعد جب زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ آئی تو اسلام، انسانیت اور علم دشمنی کی ایسی ایسی داستانیں رقم کی گئیں کہ کائنات کا کلیجہ لرز گیا۔ مسلمانوں سے بالجبر اسلام ترک کروانے کی مہم شروع کی

www.KitaboSunnat.com

گئی اور تمام سرکردہ مسلمانوں کو جن کی تعداد ساڑھے تین لاکھ تھی، پکڑ کر مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا، ان میں سے اٹھائیس ہزار پانچ سو چالیس کو موت کی سزا ملی اور بارہ ہزار کو زندہ جلا دیا گیا، ان کی سینکڑوں لائبریریاں جن میں لاکھوں کتابیں تھیں، سپردِ آتش کردی گئیں۔'' ('یورپ پر اسلام کے احسانات' از ڈاکٹر غلام جیلانی برق: ص ۱۵۷)

ایک طرف تو اہل یورپ کا 'اعتدال' پر مبنی یہ طویل نامۂ اعمال ملاحظہ کیجئے اور دوسری طرف یورپ ہی کے ان اہل علم اور اربابِ فکر کے طرزِ عمل پر بھی نگاہ دوڑائیے جن کا کام اپنی قوم کی اصلاح کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اہل قلم اور مفکرین کسی بھی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار ہوا کرتے ہیں جو اپنی قوم کے حقیقی علل و امراض کا پتہ لگا کر ان کا درست حل تجویز کریں اور ان کی اصلاح کا گراں بار فریضہ سرانجام دیں، لیکن اہل یورپ کے مجموعی طرزِ عمل سے مایوس ہوکر جب ہم اس گروہِ تحقیق سے کوئی 'اعتدال پسند دانشور' تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو چہار سو ہوکا عالم نظر آتا ہے۔ ان کی تمام تر تحقیقات، کاوشوں اور خامہ فرسائیوں کا ہدف ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ تاریخ اور حقائق کا حلیہ بگاڑ کر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی، بنیاد پرستی، علم سے تہی دامن اور تہذیب سے بے بہرہ ثابت کیا جائے اور دوسری طرف اپنی 'مہذب' قوم کی سیاہ وسفید کارروائیوں کو اعلیٰ کارنامے بنا کر پیش کیا جائے، ان کے لئے دلائلِ جواز مہیا کئے جائیں اور ان کی بدنمائیوں کو علم و تحقیق کا خوش نما اور جاذب لباس میں لپیٹا جائے تاکہ ایک طرف یہ ظلم وسفا کی کی سیاہ داستانیں بھی رقم کرتی رہے اور دوسری طرف ان تمام کارروائیوں کے لئے سندِ جواز بھی اس کے ہاتھ میں رہے۔ اگرچہ ان مفکرین کی علمی بددیانتیوں پر مبنی طویل فہرست میں سے چند ایک مثالیں یہاں بھی ذکر کی جاسکتی ہیں، لیکن اس خوف کے پیش نظر ان کو نظر انداز کیا جارہا ہے کہ اگر ایک شخص کے ظلم وسفا کی پر مبنی طویل اعمال نامے میں سے چند ایک باتوں کو بیان کردیا جائے تو درحقیقت اس کا اصل مکروہ چہرہ ان 'چند ایک مثالوں' کے پردے کے پیچھے چھپ جایا کرتا ہے اور سننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ شاید اس کے اعمال نامے میں یہی چند ایک گنے چنے جرائم ہیں جن کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

البتہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب 'یورپ پر اسلام کے احسانات' کے حوالے سے چند ایک ایسی عبارتیں پیش خدمت ہیں جو اہل مغرب کی عمومی اور مجموعی ذہنیت کی آئینہ دار ہیں اور جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو اہلِ قلم اس انداز کی سوچ اور ذہنیت کے حامل ہوں، ان

www.KitaboSunnat.com

کے قلم علم وتحقیق کے نام پر کیا کیا گل فشانیاں اور گل کاریاں کرتے ہوں گے۔

رابرٹ بریفاٹ اپنی کتاب 'تمدنِ عرب' میں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ

''یورپی مؤرخ مسلمان کو 'کافر کتا' سمجھتا ہے اور اس کا احسان ماننے کو تیار نہیں..... یورپ کے احیائے نو کی تاریخیں برابر لکھی جارہی ہیں، لیکن ان میں عربوں کا ذکر موجود نہیں..... مؤرخینِ یورپ نے عربوں کی ہر ایجاد کا سہرا اس یورپی کے سر باندھ دیا ہے جس نے پہلے پہل اس کا ذکر کیا تھا۔''

اسی طرح موسیو لیبان شَہِد شاهد من أهلها کے مصداق اپنی کتاب 'تشکیل انسانیت' میں رقم طراز ہے کہ

''ہمیں اسلام اور پیروانِ اسلام سے تعصب وراثت میں ملا ہے جو اَب ہماری فطرت کا جزو بن چکا ہے..... ہماری کم بخت تعلیم نے ہمارے ذہنوں میں یہ بات راسخ کردی ہے کہ ہمارے تمام علوم وفنون کا ماخذ یونان ہے اور یورپ کی تہذیب میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔'' (ایضاً: ص۴،۵)

مزید برآں اسلام اور اہل اسلام کے متعلق ان مفکرین کے منفی طرزِ عمل اور سوچ کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ۱۷۱۲ء میں ایڈرین ری لینڈ نے جو Utreacht یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا، جب اپنی قوم کے صدیوں پر مشتمل اسلام مخالف رویے کو محسوس کیا تو اس کے ذہن میں داعیۂ انصاف نے کروٹ لی اور بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق اس نے مسلمانوں کے متعلق یہ پہلا کلمہ خیر لکھا ہے: ''مسلمان اتنے پاگل نہیں، جتنا اُنہیں سمجھا جاتا ہے۔''

اب اس مختصر سے جملے میں اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر ایک طرف تو مسلمانوں کے متعلق اپنی قوم کے مجموعی نظریے اور سوچ کی نشاندہی کردی اور دوسری طرف یہ بھی واضح کردیا کہ اگر یہ قوم کسی درجے میں قابلِ رحم بھی ہے تو اس کی ممکنہ حد کیا ہوسکتی ہے؟ اب اس انصاف پر اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ؎ یہ معاملے ہیں نازک، جو تری رضا ہو، تو کر!

لیکن یہ ضرور عرض ہے کہ حضور! آپ کی رضا مسلمانوں کے صدیوں پر مشتمل ان علمی کارناموں پر پردہ نہیں ڈال سکتی جو آج بھی تاریخ کے اوراق میں دلائل وشواہد سے بے نیاز مہرتاباں کی طرح ضوفشاں ہیں اور جن سے آپ پہلے بھی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرنے پر مجبور ہیں بقولِ شاعر ؎ اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

www.KitaboSunnat.com

مزید برآں، اس 'معتدل مزاج' قوم کی اعتدال پسندی کا وہ مظہر تو کسی سے بھی مخفی نہیں ہے جو حالیہ دنوں میں ظہور پذیر ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے شدید احتجاج کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی گستاخی سے متعلقہ خاکے بار بار شائع کئے جا رہے ہیں اور پھر انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ اس واقعے پر معذرت کی بجائے اسے آزادئ اظہار کے پُرفریب نام سے موسوم کیا جا رہا ہے۔

اب ایک طرف تو اہل مغرب کی اس تاریخ کو سامنے رکھئے اور دوسری طرف ان مشرقی دانشوروں کے طرزِ عمل پر غور کیجئے جو یکے بعد دیگرے اعتدال اور میانہ روی کے نام پر اپنی تمام مذہبی اقدار و روایات سے دستبردار ہوتے جا رہے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ شاید ہمیں بھی تہذیب کے اس استاد کی طرف سے 'اعتدال پسند' اور 'میانہ رو' کی سندِ فضیلت جاری کردی جائے، لیکن 'عالی جاہ' کے ماتھے کی شکنیں ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہیں اور چہرے کی سلوٹیں ہیں کہ بدستور بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اہل مغرب کے یہ زلہ ربا اس دوڑ میں خدا سے تو بتدریج دور ہوتے ہی جا رہے ہیں، لیکن آثار و قرائن بتاتے ہیں کہ یہ 'وصالِ یار' سے بھی ہمکنار نہیں ہو پائیں گے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے الفاظ اس صورتِ حال کی کس قدر بھرپور ترجمانی کرتے ہیں!:

''یہ مستشرقین کی میز سے گرے ہوئے ٹکڑے کھانے والے مسلمان، یہ کعبۂ یورپ کے شوق میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ شیدائے مغرب ہونے کے بعد یہ بدقسمت مسلمان مشرقیت سے محروم ہو ہی گئے مگر اہل مغرب میں بھی اُنہیں کوئی مقام نہیں ملا۔ یہ گھر اور گھاٹ کے درمیان روایتی کتے کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔'' (مقالاتِ مولانا داؤد غزنوی: ص ۳۲۸)

اہل مغرب کا پیمانۂ اعتدال

حال ہی میں امریکی ادارے 'رینڈ کارپوریشن' (Rand Corporation) کی طرف سے ایک رپورٹ تیار کی گئی ہے جس میں مسلمانوں کو 'اعتدال پسند' بنانے کے ممکنہ وسائل اور طریقوں پر غور کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کی کچھ تفصیل ہفت روزہ 'غزوہ' کے کالم 'حقیقتِ حال' میں بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کالم کے مطابق مذکورہ رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

''حتمی نتیجہ جو پہلے ہی واضح ہے، یہ ہے کہ سچ مچ کے اعتدال پسندوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔''

یعنی پہلے تو اُنہیں پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی شدت پسند دکھائی دیئے اور اُنہیں کو اعتدال پسند بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی جبکہ دوسری طرف قابل قبول اعتدال کے تعین کے

www.KitaboSunnat.com

لئے پیمانہ بھی وہ منظور کیا گیا جو یورپ کا تیار شدہ ہو اور جس پر Made in Europe کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ کیا کہنے اس اعتدال اور انصاف کے۔ گویا کہ

ع پہلے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اُمید میں گانٹھ
پیچھے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

اعتدال کے دعویدار مسلم دانشوروں کا اپنا طرزِ عمل

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مغربی تہذیب کے دلدادہ یہ مسلمان دانشور جو اعتدال اور میانہ روی کے غلط مفہوم کو رواج دے کر مسلمانوں کو اسلام اور ایمان سے بیگانہ بنانا چاہتے ہیں، وہ خود اپنے اس نظریے میں کہاں تک روادار ہیں۔ اگر یہ واقعی اعتدال پسند ہیں تو اعتدال پسندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ اختلاف کرنے والے کی رائے کو وسعت ظرفی اور خندہ پیشانی کے ساتھ سنا جائے اور اس کی رائے کا خیر مقدم کیا جائے۔ اگر اس کے پیش کردہ نظریے سے اتفاق نہ ہو تو ادب و احترام کے تمام قرینوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دلائل کے ساتھ اس کے ذہن میں وارد شدہ اشکالات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ مطمئن ہو جائے تو فبہا ورنہ اس کی ذات کو نشانۂ تنقید بنانے سے بہرصورت اجتناب کیا جائے جبکہ ہمارے ان 'اعتدال پسند' دانشوروں کا بنیادی وصف ہی یہ ہے کہ جو کوئی بھی ان کے اس خانہ ساز نظریۂ اعتدال سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہے تو طنز و تعریض کے زہر میں ڈوبے ہوئے تیروں کے ذریعے اس کی ذات کو نشانۂ تنقید بنالیا جاتا ہے۔ چنانچہ کبھی تو اس کو بنیاد پرست، قدامت پسند اور جاہل ملّا کے اَلقاب سے نواز کر اپنی تسکینِ طبع کا سامان کیا جاتا ہے اور کبھی اس کو جاہل، اُجڈ، گنوار، دورِ جدید کے تقاضوں سے ناآشنا اور فرقہ پرست ٹھہرا کر اپنی 'اعتدال پسندی' اور 'میانہ روی' کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔

اُنہیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہو پاتی کہ جو کردار کسی مخصوص فرقے اور گروہ سے وابستہ ایک 'بنیاد پرست ملّا' ادا کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ زہریلا طرزِ عمل یہ 'ملایانِ افرنگ' خود اپنے مخصوص نظریات و مقاصد کے لئے اپنائے ہوئے ہیں۔ بلکہ مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ ہمارے یہ نام نہاد جدت پسند دانشور، فرنگیوں کی محبت میں سرشار ہو کر اسی قسم کے اعتدال اور میانہ روی کو اپنائے ہوئے ہیں جس کا مظاہرہ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز ہنگامہ میں بابا گورونانک کی نام لیوا اور 'بامسلمان اللہ اللہ، با برہمن رام رام' کے نظریۂ اعتدال پر عمل کی

www.KitaboSunnat.com

دعویدار اقوام نے دکھایا تھا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر اپنے دین و ایمان سے گہری وابستگی ہی شدت پسندی اور بنیاد پرستی کہلاتی ہے تو پھر اسی نوع کی اعتدال پسندی کو آخر کس نام سے پکارا جائے گا بلکہ یہ تو دوہرا جرم ہوا کہ دعویٰ تو اعتدال کا جب کہ اس کی تبلیغ کے لئے لب ولہجہ ایک متعصب ملا سے بھی زہریلا! اپنے متعلق یہ خوش فہمی کہ ہم میانہ رو ہیں جب کہ کردار ایک شدت پسند سے بھی بدتر۔ غالباً اسی طرح کی صورتِ حال کے متعلق عربی میں کہا گیا ہے کہ فرَّ من المطر وقام تحت المیزاب کہ بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اعتدال پسندی اور میانہ روی سے یہی مقصود ہے کہ انسان کے اندر ایسی قوتِ برداشت پیدا ہوجائے جس سے وہ ہر غلط یا صحیح نظریے کے حضور سرِ تسلیم خم کردے خواہ وہ نظریہ اس کی اپنی فکر سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو تو آپس کی رنجشوں سے اس نظریے کے وکلا خود کیوں محروم ہیں اور ان کا اپنا لب ولہجہ اس گراں قیمت خوبی سے کیوں ناآشنا ہے؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لئے کسی گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قول وعمل میں اس تعارض کا سبب دراصل یہ ہے کہ ہمارے یہ نام نہاد اعتدال پسند دانشور خود بھی اپنے اس نظریے کے ساتھ مخلص نہیں ہیں بلکہ درحقیقت اعتدال پسندی کو آڑ بنا کر اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں مغرب کے اس خودساختہ نظریۂ اعتدال کی پُرزور وکالت کرنے والوں میں دو طرح کے لوگ شامل ہیں اور یہ دونوں گروہ اپنی اخلاقی کمزوری کے باعث اصل بات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ پینترے بدل بدل کر اس کے حق میں دلائل دیتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ایک گروہ میں تو ایسے لوگ شامل ہیں جن کا خیال ہے کہ زندگی میں قدم قدم پر مذہب سے رہنمائی لینا اور مذہبی حدود و قیود کی جکڑبندیوں میں اُلجھے رہنا ایک بالکل فضول سی بات ہے جس کو خواہ مخواہ لوگوں نے اس قدر شدت کے ساتھ اپنا رکھا ہے اور یہ کہ انسان اپنی نجی زندگی میں بالکل آزاد ہے وہ اپنی بہیمی قوتوں کی تسکین کے لئے جو چاہے ذرائع استعمال کرتا پھرے، اسے کسی طور بھی مذہب کی چاردیواری میں مقید نہیں رکھا جاسکتا، کیونکہ مذہب کا انسان کی عملی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ تو چند مخصوص عبادات کے مجموعے کا نام ہے اور بس۔ اب چونکہ ان کے قبلہ وکعبہ یورپ میں اس نوع کے عقائد ونظریات کے لئے

www.KitaboSunnat.com

ماحول پہلے ہی سے سازگار ہے اور وہ پہلے ہی مذہب کو جلا وطن کر چکے ہیں۔ لہٰذا اس کامل ذہنی اتحاد کی بنا پر اُنہوں نے یورپ ہی کو اپنی عقیدتوں اور اُمنگوں کا مرکز ٹھہرا لیا اور اسی کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا قبلہ و کعبہ جانا، حتیٰ کہ اس حسنِ عقیدت میں خدا اور رسولؐ کو فراموش کر کے مغرب ہی کو اپنا پیغمبر اور پروردگار قرار دے لیا اور مولانا ظفر علی خانؒ کے الفاظ میں یورپ کو مخاطب کر کے زبانِ حال سے پکارنے لگے کہ

پیغمبر جمال تیری دل رُبا ادا
پروردگارِ حسن تیرا چلبلا چلن

اب ظاہر ہے کہ اس نوع کے ملحدانہ عقائد و نظریات ایسی قوم میں کہاں جگہ پا سکتے ہیں جس کا دامن ایک ایسے عظیم الشان مذہب کے بندھن میں بندھا ہو کہ جس کی سادہ اور فطرت کے موافق تعلیمات تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی ہوں۔ جو اپنے ماننے والوں کو خارزارِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی تنہا اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا نہ چھوڑے اور جو اُن کے لئے ایک ایسا مربوط، ہمہ جہت اور عالمگیر نظام تشکیل دے جو دنیوی اور اُخروی دونوں زندگیوں کی فلاح کا ضامن ہو۔ لہٰذا ایسے ناسازگار حالات میں ہمارے یہ جدت پسند دانشور ایک طرف تو خود کو اعتدال پسند اور میانہ رو کہہ کر اپنے ان ملحدانہ عقائد و افکار کے لئے وجہِ جواز پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف میانہ روی اور اعتدال پسندی کے پس پردہ درحقیقت مسلمانوں کو تقلید یورپ کے بے رحم شکنجے میں جکڑنا چاہتے ہیں۔

جبکہ دوسری قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جو اس قسم کے خطرناک عقائد و نظریات کے حامل تو نہیں ہیں اور اسلامی اقدار و روایات کو اپنی زندگیوں سے دیس نکالا نہیں دینا چاہتے۔ لیکن گاہے بگاہے بعض معاملات میں مغربی تہذیب کی چکاچوند روشنی سے بھی ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اب یہ حضرات مسلمان رہتے ہوئے 'نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن' کے مصداق نہ تو ایسے اسلامی احکامات سے کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کر سکتے ہیں جو مغربی تہذیب کی طبع نازک پر گراں گزرتے ہوں اور نہ ہی ایسے احکامات کو اپنانا ان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ کہیں مغرب ہمیں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے 'گناہِ کبیرہ' سے متصف نہ ٹھہرا دے۔ گویا کہ ایسے میں یہ لوگ بقولِ شاعر:

www.KitaboSunnat.com

؎ ایمان مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس دوطرفہ اُلجھن کا حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ اعتدال اور میانہ روی جو کہ فی الواقع اسلام کے بنیادی اوصاف و خصائل میں شامل ہے، کا سہارا لیا جائے اور پھر ایسے تمام اسلامی معاملات کو جن میں مغرب کی تقلید مقصود ہو، اپنے خانہ ساز نظریہ اعتدال کی سان پر چڑھا کر ان سے چھٹکارا حاصل کرلیا جائے۔

درحقیقت مذکورہ دونوں گروہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر ہم ایسی اقدار و روایات کو چھوڑ دیں جو مغرب کو انتہا پسندی اور شدت پرستی سے متصف دکھائی دیتی ہیں تو مسلمان رہنے کے باوجود ہم مغرب کے منظورِ نظر بن جائیں گے اور ہمارے دامن سے انتہا پسندی کے تمام دھبے دھو دیئے جائیں گے اور ہمارے ماتھے سے بھی روشن خیالی کی شعاعیں پھوٹنے لگیں گی۔ لیکن ازلی و ابدی صداقتوں کی ترجمان، ربّ العالمین کی کتاب کچھ اور کہہ رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (البقرۃ:۱۲۰)

''یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اگر اس علم کے بعد، جو اللہ نے بتایا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔''

اعتدال کا اسلامی تصور اور جدت پسند دانشور

مجھے یقین ہے کہ آج اگر مغرب کی خالص مادہ پرست تہذیب کی جگہ کوئی اور تہذیب و ثقافت اپنی حشر بداماں جلوہ سامانیوں اور غارت گر دین و ایمان روشنیوں کے ساتھ کرۂ ارضی کو خیرہ کئے ہوئے ہوتی تو ہمارے یہ جدت پسند دانشور اسی تہذیب کی زلہ ربائی کو اعتدال پسندی کے دل فریب نام سے موسوم کرتے اور اسی کی خوشہ چینی کو اپنی میانہ روی اور روشن خیالی کا منتہاے کمال تصور کرتے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے عروج کے دور میں کسی کے دل میں

www.KitaboSunnat.com

اس نوع کی اعتدال پسندی اور مذہبی رواداری کا سودا کیوں نہیں سماتا تھا !؟ اس وقت کسی صاحبِ درد کے دل میں یہ خواہش انگڑائی کیوں نہیں لیتی تھی کہ دوسروں کے دین و مذہب کے احترام میں کچھ اسلامی اقدار و روایات کو ترک کر دینا چاہئے یا ان میں نرمی پیدا کر لینی چاہئے؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کو ہی اعتدال پسندی کے نام سے موسوم کرتے اور اس کے حضور جھک جانے کو ہی مذہبی رواداری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے قلوب واذہان میں یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ تہذیبِ وقت کے مطابق خود کو ڈھال لینے ہی سے آدمی پر دین و دنیا کی کامیابی کے دَر وا ہوتے ہیں اور پھر یہ لوگ اسلام کے اُصول وقواعد کو بھی اپنی اسی مخصوص سوچ کے تناظر میں ڈھلے ہوئے دیکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر ایسا مان لیا جائے تو پھر وہ چیز جسے ہم 'اسلام' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا اپنا وجود کہاں باقی رہ جائے گا اور پھر خود ہماری علیحدہ شناخت کے لئے کیا جواز باقی رہ جاتا ہے جو اسلام کے نام پر علیحدہ وطن کی لکیریں کھینچتے اور 'دو قومی نظریہ' جیسے نعرے ایجاد کرتے ہیں۔ یہاں میں شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے الفاظ بھی نقل کرنا چاہوں گا جن کا مقام خود ہمارے نام نہاد متجد دین کے ہاں بھی مستند ہے اور جن کے کلام کو غلط سہارا بنا کر یہ گروہِ متجد دین، علماے کرام کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ چنانچہ شاعر مشرق، جواہر لعل نہرو کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

''جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل نہیں سمجھتے۔ رواداری کی روح ذہن انسانی کے مختلف نکتہ ہائے نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر وعمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہو، کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر وعمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیا یا اشخاص پر روا رکھی جاتی ہے، برداشت کر لیتا ہے۔'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ

''کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کر لے (یہ کیا ہوا کہ) اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو؟ خواہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔''

('فیضانِ اقبال' از شورش کاشمیری، ص ۱۶۸ و ۳۱۳)

www.KitaboSunnat.com

آمدم برسرِ مطلب، دوسروں کی خوشنودیٔ خاطر کے حصول کے لئے اپنے مذہب اور عقیدے کی قربانی دے دینا، یا اس کے بعض ایسے بنیادی اصول وقواعد میں، جو مخالف کی طبع نازک پر گراں گزرتے ہوں، ترمیم کرلینا یا ان کا حلیہ بگاڑ کر ان کے متعلق معذرت خواہانہ انداز اپنا لینے کو آخر کس ڈکشنری اور لغت کی رو سے اعتدال پسندی اور مذہبی رواداری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ مدمقابل اپنی طے شدہ فکر اور سوچ میں نرمی پیدا کرنا تو درکنار، اس سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونے کو تیار نہ ہو۔ میرے خیال میں اس طرزِ عمل کو کسی بھی صاحبِ عقل کے نزدیک خوشامد، چاپلوسی اور کاسہ لیسی سے موسوم کرنا زیادہ قرینِ انصاف ہوگا۔ کیونکہ اس نے اپنے مذہب کو مدمقابل کے مذہب اور اپنی مرضی کو مدمقابل کی مرضی کے تابع بنا دیا ہے۔ اب گویا کہ اس کا اپنا تو کوئی مذہب رہا ہی نہیں جس میں وہ روادار اور اعتدال پسند ہونے کا دعویٰ کرے۔ کیونکہ اعتدال اور رواداری سے مراد تو یہ ہے کہ آدمی کو اپنے مدمقابل کے ساتھ فکر ونظر کے بہت سارے زاویوں میں اختلاف ہو اور بھرپور اختلاف ہو، گویا کہ بالفاظِ دیگر، دونوں میں ذہنی تصادم اور فکری تناؤ کی پوری صورتِ حال موجودہ ہو، لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کو برداشت کریں اور ایک دوسرے کی فکری آزادی کو تسلیم کریں اور بالفرض اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک، دوسرے پر کسی بھی اعتبار سے اختیار واقتدار رکھتا ہو تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسرے کو اس کے نظریے اور فکر کے مطابق چلنے کی آزادی دے اور اس کی مرضی کو جبراً اپنی مرضی کے تابع بنانے یا اس کی سوچ کو اپنی سوچ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرے اور یہی وہ حقیقی اعتدال اور میانہ روی ہے جو صحیح معنوں میں صرف اسلام ہی کا طرۂ امتیاز ہے اور کوئی بھی دوسرا مذہب اس عظیم خوبی میں اس کا شریک وسہیم نہیں ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہوچکی ہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا﴾

''اس قوم کی نفرت جس نے تم کو کعبہ سے روکا تھا تم کو ادھر کھینچ کر نہ لے جائے کہ تم بھی ان پر زیادتی کرنے لگو۔'' (المائدۃ:۲)

www.KitaboSunnat.com

اسلام کی اسی پاکیزہ تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کی پوری تاریخ غیر مسلموں کے ساتھ اسی اعتدال اور میانہ روی سے عبارت ہے۔ جس وقت اسلام کی وسیع وعریض سلطنت میں بے شمار مذاہب سے وابستہ لاتعداد لوگ آباد تھے، اس وقت بھی کسی سے نہ تو جبراً اسلام قبول کروایا گیا اور نہ ہی کسی خاص مذہب سے وابستہ لوگوں کی مذہبی آزادی سلب کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ ان کے لئے علیحدہ حقوق متعین کئے گئے۔ ان کا علیحدہ تشخص تسلیم کیا گیا اور اُنہیں جان و مال اور عزت کے تحفظ کی بھرپور ضمانت فراہم کی گئی۔ حتیٰ کہ دوسرے مذاہب و ادیان سے وابستہ لوگوں کے معابد کی حفاظت وصیانت کا بارِگراں بھی مسلمانوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھایا اور اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دے کر پوری دنیا کے لئے اعتدال اور میانہ روی کے اعلیٰ نمونے قائم کئے۔ قاضی سلیمان منصور پوریؒ آیت مبارکہ ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ... الخ﴾ کے متعلق لکھتے ہیں کہ

''اسلام کی جنگیں نہ اپنی تعلیم کی اشاعت کے لئے تھیں اور نہ دوسرے مذاہب کے لئے موجبِ اکراہ تھیں۔ ربّ العالمین نے اسلامی حروب کے متعلق جو وجہ بیان کی ہے وہ قرآنِ مجید میں موجود ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَ مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا﴾ (الحج:۴۰)

''اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی مدافعت نہ کرتا اور بعض کے ذریعے بعض کو نہ ہٹا دیتا تب صَوامع (خانقاہیں) اور بِیَع (گرجے) اور صلوٰت (معابد) اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بہت کیا جاتا ہے، ضرور گرادی جاتیں۔''

آیت بالا ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کی اجازت اس لئے دی گئی کہ وہ جملہ مذاہب کی آزادی کو قائم کردیں، بدامنی دور کردیں، پارسیوں، عیسائیوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مسلمانوں کی مساجد کو کوئی شخص نہ گرا سکے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسلمانوں ہی کا حوصلہ تھا کہ اپنی جانیں قربان اور اپنے سینوں کو آماجِ تیروسنان بنا کر غیر مسلمانوں کے معابد کی حفاظت کی، کیا کوئی اور قوم بھی اپنی بے تعصبی کا ثبوت اس طریقہ سے دے سکتی ہے۔'' (رحمۃ للعالمین، ۳/۳۷۵)

چنانچہ حقیقت یہی ہے کہ اسلام ہی دنیا کا سب سے زیادہ اعتدال پسند اور غیر متعصب مذہب ہے۔ لیکن دین کے اُصول وقواعد میں مداہنت اور نرمی کو اسلام اعتدال پسندی نہیں بلکہ منافقت اور غداری سے تعبیر کرتا ہے۔ حالات موافق ہوں یا مخالف، کسی مسلمان کے لئے روا

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہے کہ مذہبی رواداری کے نام پر اسلام کے اُصول وقواعد میں ترمیم کرتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ سچ بات کہنے والا ایک بھی ہو تو اسلام کی نگاہ میں وہ ایک پوری اُمت کے مترادف ہے۔﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً﴾(النحل:۱۲۰)''بے شک ابراہیمؑ ایک جماعت تھے۔''

لیکن لوگوں کی کثرت اور غلبے سے گھبرا کر ان کی خوشامد اور چاپلوسی میں حق کو چھپانے والے لاکھوں بھی ہوں تو اسلام کی نگاہ میں وہ ایک ذرّۂ بے مایہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ﴿فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾(الرعد:۱۷)''جو راکھ ہے وہ رائیگاں ہی جاتی ہے۔''

لوگوں کی اکثریت کا کیا ہے؟ یہ تو بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ:

''ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے، انکار پر آئیں گے تو مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیں گے۔''(غبارِ خاطر،۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریک کے آغاز میں جب مشرکینِ مکہ نے رسول اکرم ﷺ کو پیشکش کی کہ آؤ! جسے تم پوجتے ہو اسے ہم بھی پوجیں، اور جسے ہم پوجتے ہیں اسے تم بھی پوجو، اور اس طرح ہم اور تم اس کام میں مشترک ہوجائیں تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پوری سورۃ الکافرون نازل فرمائی۔ جس میں واشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ جسے تم لوگ پوجتے ہو، اسے میں پوج ہی نہیں سکتا۔(ابن ہشام،۱/۳۶۲)

لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ جسے مسلمان رہنا ہے اور اسلام کی غلامی کو اپنے گلے کا ہار بنانا ہے، تو اسلام اس کی زندگی کو راس آئے یا نہ آئے، اس کے اُصول وقوانین اس کے معیارِ اعتدال پر پورے اُترتے ہوں یا نہ اور اس کے قواعد وقوانین اسے جدید دکھائی دیں یا قدیم اور دقیانوس۔ اسے چار وناچار اور علیٰ الاعلان اپنی مسلمانی کا ڈھول پیٹنا ہی ہوگا اور ڈنکے کی چوٹ پر دنیا کے سامنے اپنے اس عقیدے کا اظہار کرنا ہی پڑے گا کہ

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ ''کہہ دو، اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے والا ہوا جن کو تم نے پوجا اور نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں پوجتا آرہا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین۔''

www.KitaboSunnat.com

LRL No.183
Vol. 40 NO. 7
Monthly MUHADDIS Lahore
☏ 5866476
5866396

- عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

- تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

- آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے ——— زرِ سالانہ ۲۰۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore 54700